لو ایک قصّہ سنو!

اور

دوسرے افسانے

اختر انصاری

ناشر

یونیورسٹی پبلشرز۔ علی گڈھ

طبع اوّل سنہ ۱۹۵۳ء ایک ہزار
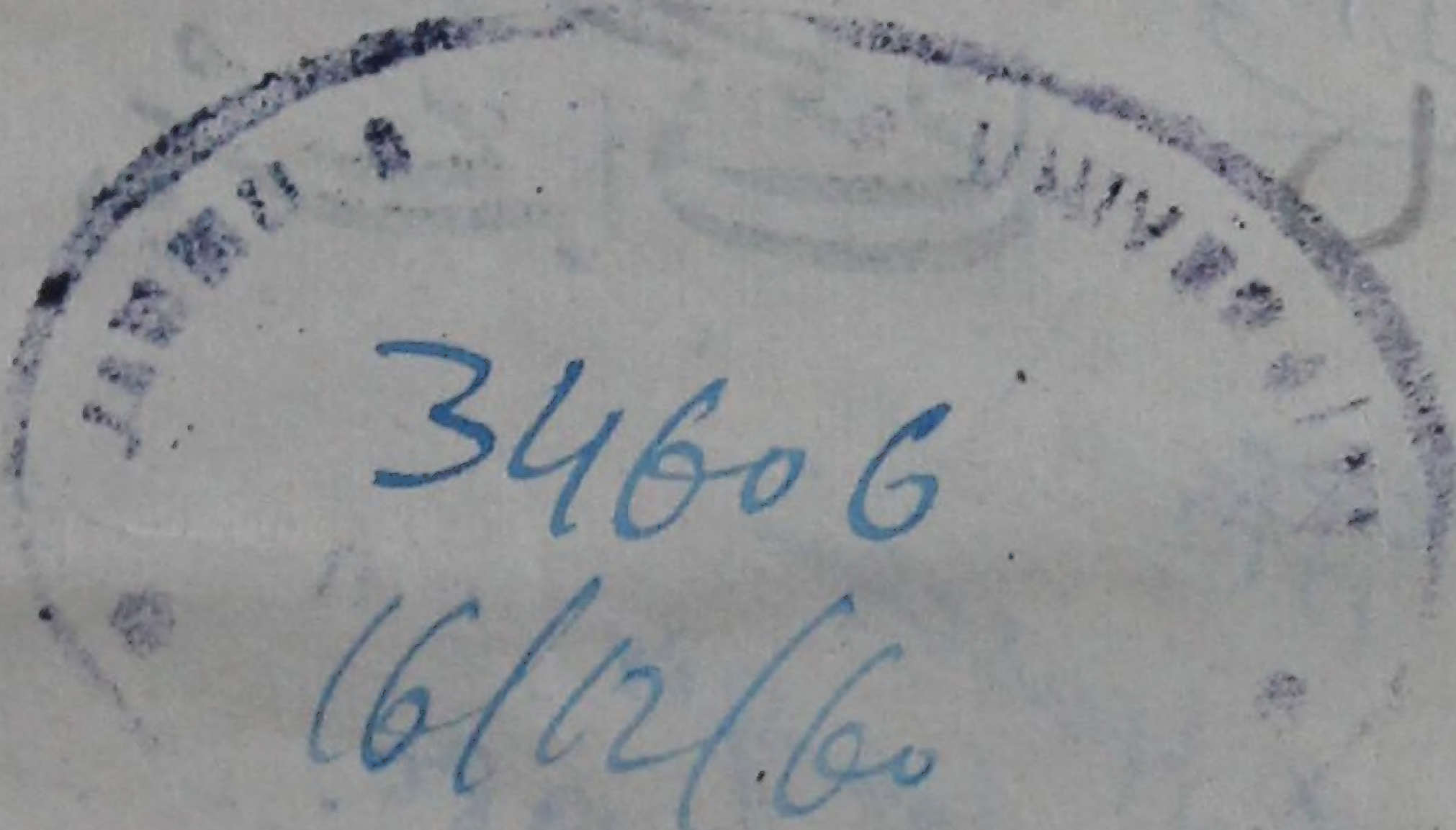
قیمت دو روپے بارہ آنے

یونین پرنٹنگ پریس دہلی

Muzaffar Hussain Alamgir
M.Com. Prev.
1980.

Please don't go through this book.
Because it presents
no source of entertainment.

فہرست

وہ عورت

(۱۹۴۶ء)

رات میں آٹھ اور نو بجے کے درمیان نمائش میں داخل ہوا تو مجھے کیا خبر تھی کہ آج یہاں ایک نہایت دلچسپ دھوکے سے سابقہ پڑنے والا ہے۔ اور سچ پوچھیے تو مجھے کل رات ایک نہیں دو دھوکے ہوئے۔

میں گھر سے سیدھا نمائش نہیں گیا تھا۔ بلکہ ایک دوست کے یہاں ہوتا ہوا گیا تھا۔ اگر براہِ راست جاتا تو حسبِ معمول مشرقی دروازے سے نمائش میں داخل ہوتا۔ مگر پہلے شہر گیا، اپنے دوست کے نمائشی مہمانوں سے یعنی ان مہمانوں سے جو نمائش کے سلسلے میں باہر سے آئے ہوئے تھے ملاقات کی، اور پھر شاہراہوں اور گرد وغبار سے اَٹی ہوئی سڑکوں سے بچتا بچاتا، پیچ پیچ گلیوں اور تنگ وتاریک کوچوں سے ہوتا ہوا نمائش پہنچا۔ اب مشکل یہ ہے کہ جب تک خاص طور پر توجہ نہ کی جائے، نمائش کی رونق، بھیڑ بھاڑ، چہل پہل، اور بے اندازہ پھیلاؤ کی وجہ سے آدمی کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کس سمت سے اور متعدد راستوں میں سے

کس راستے سے نمائش میں داخل ہو رہا ہے۔ مجھے اپنے سامنے جو دروازہ نظر آیا میں سمت کا لحاظ کئے بغیر اُس سے داخل ہو گیا۔ مگر جب داخل ہو گیا تو پتہ چلا کہ میں نے دھوکا کھایا ہے، اور جنوب مغربی دروازے سے داخل ہو گیا ہوں۔ ایسا کرنا کوئی جرم نہیں تھا۔ نہ اِس کی کوئی ممانعت تھی۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ بہت سے لوگ ادبدا کے اسی دروازے سے نمائش میں داخل ہوتے ہیں۔ اور وہ اس لئے کہ اس دروازے میں گھُستے ہی جو بازار آتا ہے اُس میں اِدھر سے اُدھر تک تیل اور عطر، سرمہ اور مسّی، کنگھیوں اور چوڑیوں اور نسوانی زیبائش کے دوسرے ساز و سامان ہی کی دوکانیں ہیں، اور نتیجہ اس کا یہ ہے کہ نمائش کا یہ علاقہ کالی زلفوں، گوری باہوں، دمکتے ہوئے چہروں، سریلی آواز، اور جھلملاتے ہوئے ملبوس والی مخلوق سے کھچا کھچ بھرا رہتا ہے۔ میرے نزدیک اگر واقعی کوئی خریداری مقصود نہ ہو تو نمائش کے اس حصّے میں جانا گویا اس بات کا اعلان کرنا ہے کہ ہم ندیدے ہیں، آنکھیں سینکنے اور اپنے نفس کو موٹا کرنے کے لئے نمائش میں آئے ہیں۔ اور پوری ڈھٹائی کے ساتھ اس مقصد کے حاصل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اخلاقی جواز یا عدم جواز کی بحث میں پڑنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ ہر خوش ذوق اور سلیم الطبع شخص تسلیم کرے گا کہ یہ چیز بھدی، مکروہ اور نامناسب ہے، اور زیادہ سے زیادہ فیاضانہ اندازِ نظر اختیار کیا جائے، تب بھی بد مذاقی اور پھوہڑپن کا مظاہرہ تو ضرور قرار پاتی ہے اسی باعث جب میں نے اپنے آپ کو اپنی کوشش اور خواہش کے بغیر، اور ایک معمولی دھوکے کی بنا پر نمائش کے اس بازار میں پایا تو مجھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوا میں سٹپٹا سا گیا۔ اور ایسا محسوس کرنے لگا گویا مجھ سے چوری کا جرم سرزد ہوا ہے۔ میں نے گھبرا

کر ادھر اُدھر دیکھا، یہ معلوم کرنے کے لئے کہ مجھے کسی نے دیکھا تو نہیں یا کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ گویا اس بازار کی فضا میں میرا دم گھٹا جا رہا ہے، اور میں جلد سے جلد ایسی جگہ پہنچ جانا چاہتا ہوں جہاں اطمینان کے ساتھ سانس لے سکوں۔ لیکن پھر اس تیز رفتاری میں بھی مجھے قباحت نظر آئی۔ میں نے سوچا کہیں اپنی کود پھاند کی بنا پر ہی میں لوگوں کی توجہ کا مرکز نہ بن جاؤں، کہیں دیکھنے والے یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ یہ شخص کسی نوجوان عورت کو چھیڑ کر یا کسی بوڑھی عورت کا بٹوہ چرا کر بھاگا ہے۔ چنانچہ میں نے پھر اپنی رفتار کو کسی قدر دھیما کر دیا۔ تاہم میری اس خواہش میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی کہ جس قدر جلد بھی ممکن ہو میں اس بازار سے گذر جاؤں۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ ابھی اسی بازار میں مجھے ایک بے حد دلچسپ دھوکے سے سابقہ پڑنے والا ہے۔

میں منہ اٹھائے چلا جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک عورت آتی ہوئی دکھائی دی۔ یوں تو وہاں عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ عورتوں ہی کا جو بازار ٹھہرا۔ چند ایسے مردوں کے علاوہ جن کی بھنکتی ہوئی صورتوں سے ناریدہ پن اور اٹھائی گیرا پن ٹپکتا تھا، یا چند ایسے خوش وضع اور خوش قطع نوجوانوں کو چھوڑ کر جن کی آنکھوں سے جنسی بھوک کی بوکھلاہٹ ابلی پڑتی تھی، وہاں عورتوں کے سوا اور تھا کون؟ کالے برقعوں والی عورتیں، اور سفید برقعوں والی عورتیں۔ ساڑی پہننے والی عورتیں اور دھوتی باندھنے والی عورتیں قمیص اور شلوار پہننے والی عورتیں۔ اور کرتا اور ڈھیلے پائینچوں کا پاجامہ پہننے والی عورتیں۔ چاندنی جیسے دودھیا رنگ والی عورتیں، اور شعلے کی طرح لال بھبوکا عورتیں سانولی عورتیں اور سیاہ فام عورتیں۔ غرض کہ میرے چاروں طرف انواع و اقسام

کی عورتوں کا ایک گھنا اور لہلہاتا ہوا جنگل اُگا ہوا تھا۔ مگر میں اپنے چاروں طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ میری نظریں سامنے کی جانب تھیں۔ چونکہ وہ عورت سامنے سے آرہی تھی، اس لئے قدرتی طور پر میں نے اسے دیکھا۔ دیکھنا اصل میں دو طرح کا ہوتا ہے ایک تو سرسری، چھلتی ہوئی اور اچٹتی ہوئی نظر سے دیکھنا، جیسے ہم سڑک پر بجلی کے کھمبے کو یا گائے بیلوں کو دیکھتے ہیں۔ دوسرے نظر جما کر اور غور کے ساتھ دیکھنا۔ گویا اس دوسری طرح کے دیکھنے میں ذہنی عمل کا عنصر ذرا زیادہ ہوتا ہے جب آدمی بازار میں چلتا ہے تو اپنے دائیں بائیں اور سامنے ایک سطحی اور سرسری نظر ڈالتا ہوا چلتا ہے۔ اگر ایسا نہ کرے تو کبھی بجلی کے کھمبے سے متصادم ہو، کبھی کسی آدمی یا جانور سے ٹکرائے، اور لازمی طور پر قدم قدم پر ٹھوکر کھائے۔ مگر کبھی کبھی اور کہیں کہیں اُسے نظر جما کر بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ کوئی جان پہچان کا آدمی یا کوئی حسین عورت، یا کوئی عجیب الہیئت شخص یا کوئی بھی ایسی چیز جس سے اس کو کسی نہ کسی طور پر کوئی وقتی یا مستقل دلچسپی ہو اُس کی توجہ کو جذب کر سکتی ہے، اور اُسے غور کے ساتھ دیکھنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ میرے سامنے سے جو عورت آرہی تھی اس میں کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ صورت میں کوئی دل آویزی، خدوخال میں کوئی رنگینی، چال ڈھال میں کوئی خاص حسن، لباس میں کوئی نظر فریبی، غرض کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو کسی شخص کی توجہ کو جذب کر سکتی، اور اسے غور کے ساتھ دیکھنے پر مجبور کر دیتی۔ پھر بھی میری نظر اس پر پڑی تو جم کر رہ گئی۔

وہ ایک سادہ اور معمولی برقع پہنے ہوئے تھی۔ ماتھے اور ٹھوڑی کے کچھ حصے کے علاوہ چہرہ کھلا ہوا تھا، جس کا رنگ گندمی تھا اور جو ٹیپ ٹاپ یا مشاطگی کے

اثرات سے بالکل مبرّا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن تھیں جن کو اس نے میرے چہرے پر گاڑ دیا تھا۔ میرا خیال ہے یہ اُس کا اِس طرح مجھے غور سے دیکھنا ہی تھا جس کی بنا پر میری نظر اس کے چہرے پر پڑی تو جم کر رہ گئی۔ اُس وقت میں نے اپنے دل میں کہا: "باوجود اس کے کہ یہ عورت مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی ہے اس کے دیکھنے کا انداز کچھ ایسا ہے کہ اُس میں بے باکی اور بے حیائی کا کوئی خفیف سا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ نہ شوخی و شرارت ہی کا کوئی اثر ہے۔ اس کی نظر گناہ کی پیش کش نہیں ہے۔ نہ گناہ کی دعوت ہے۔ نہ اس میں وہ شعلہ ہے جو جنس یا جنسیت کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں جو کیفیت ہے اُس کو سادگی یا معصومیت یا بھولے پن کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں دیا جا سکتا۔ جو سادگی اس کے لباس میں، اس کی چال ڈھال میں، اور اس کے چہرے کے نقوش میں ہے وہی سادگی یقیناً اس کے خیالوں میں پائی جاتی ہے، اور اس کی نظر سے ٹپکتی ہے۔ یہ بے چاری اوسط طبقے کی کوئی سیدھی سادھی عورت ہے۔ بیچاری ......" میرا یہ مطلب نہیں کہ ان چند لمحوں کے اندر یہ تمام الفاظ اور یہ ساری عبارت میرے ذہن میں آئی۔ کہنا صرف یہ ہے کہ میں نے اُس عورت کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا، اور خود اس کو دیکھا تو کچھ اس قسم کے خیالات تھے جو میرے دماغ میں پیدا ہوئے۔ اور یہی سب کچھ سوچتا ہوا میں اس کے برابر سے نکل گیا۔

اب اگر اِس میں میں نے کوئی دھوکا کھایا تو انصاف کی بات یہ ہے کہ قصور میرا نہیں تھا بلکہ نمائش کے ماحول کا تھا۔ سچ پوچھئے تو یہاں دھوکے کے سوا رکھا ہی کیا تھا۔ نئے زمانے کی جدید الوضع اور خوبرو خواتین۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے کے

خوش پوش اور خوش حال مرد، بے فکری کے قہقہے۔ فضا میں بسی ہوئی خوشبوئیں،
لاوڈسپیکروں سے بلند ہونے والے فلمی نغمے، ہر قسم کے بیش قیمت سامان سے
بھری ہوئی دوکانیں، روشنیوں کا سیلاب، رونق، چہل پہل، ہنگامہ اور
ریل پیل، ـــــ یہ سب دھوکا نہیں تو اور کیا تھا۔ میں ان چیزوں کو اُن معنوں
میں دھوکا نہیں کہہ رہا ہوں جن معنوں میں پرانے زمانے کے رشی، منی، جوگی،
سادھو اور مہاتما دنیا اور دنیا کی ہر چیز کو دھوکا اور مایا جنجال خیال کرتے تھے۔
میرا نقطۂ نظر دوسرا ہے۔ اب مثال کے طور پر ان عورتوں ہی کو لیجئے! کیا کہنا ہے
ان کے حسن کا! کیا بات ہے ان کے رنگ روپ کی! کیا ٹھکانا ہے اُس کشش
کا جو ان کے نسائی پیکروں میں مردوں کے لئے پائی جاتی ہے! مگر ذرا ان کو قریب
سے دیکھئے۔ لمحہ بھر کے لئے اپنی نظر کو غازہ و روغن کی اُس دبیز تہہ میں اتر جانے
دیجئے جو اِن کے چہروں پر چڑھی ہوئی ہے۔ اور بجلی کے قمقموں کی جو چھوٹ اِن
کے رخ و عارض کی آب و تاب بنی ہوئی ہے، اس میں بھی تھوڑی سی کمی کر دیجئے،
اس کے بعد بتائیے کہ کیا ان میں سو میں سے پانچ بھی ایسی ہیں جن کو حسین کہا
جا سکے؟ پھر یہ سب کی سب ایک دھوکا نہیں ہیں تو اور کیا ہیں؟

ابھی چند روز پہلے کی بات ہے اور اسی نمائش کا ذکر ہے کہ تین چار نوجوان
ایک جگہ کھڑے تھے۔ کوئی پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر تین لڑکیاں ایک دوکان
پر کھڑی بظاہر کچھ خریداری کر رہی تھیں۔ نوجوانوں نے لڑکیوں کی طرف اپنی نظروں
کا نشانہ باندھ رکھا تھا۔ لڑکیاں بھی اگر ایک بات دوکان دار سے کرتی تھیں تو
تین دفعہ نوجوانوں کی طرف دیکھتی تھیں۔ سیاہ برقعوں کے پس منظر میں اُن کے

کھلے ہوئے چہرے بدلی کے چاند کی طرح بہار دے رہے تھے۔ اگر ایک طرف نوجوان ان کے حُسن اور حسن سے زیادہ اُن کے التفاتِ بے حساب پر فریفتہ ہو رہے تھے تو دوسری طرف وہ خود نوجوانوں کو رجھانے میں اپنی نسائیت کے تمام حربوں سے پورا کام لے رہی تھیں۔ غرضکہ ایک دلفریب مشغلہ تھا جو کئی گھنٹے جاری رہا۔ لڑکیاں دوکان تبدیل کرتی رہیں اور اسی نسبت سے نوجوان اپنے کھڑے ہونے کی جگہ بدلتے رہے ـــــ درمیانی فاصلہ بدستور قائم رہا۔ مگر آخر کار ایک ایسا وقت بھی آیا جب یہ دوُری ختم ہوگئی، یعنی وہ چاروں نوجوان ایک فوٹوگرافر کی دوکان پر کھڑے ہوئے تصویر کھچوانے پر آمادگی ظاہر کر رہے تھے کہ تینوں لڑکیاں ان کے برابر سے "یہ منہ اور مسور کی دال" کہتی ہوئی نکل گئیں۔ نوجوان ایسے حیرت زدہ ہوئے کہ قہقہہ لگانا بھی بھول گئے۔ ان کا کہنا ہے وہ برابر سے نکلیں تو پتہ چلا وہ لڑکیاں نہیں تھیں بلکہ ادھیڑ عمر کی عورتیں تھیں، اور اگر لڑکیاں تھیں تو یقیناً تینوں سہ توق تھیں۔ پھر ان کی رنگت ایسی تھی کہ ان کو سانولا کہنا بھی ان کے ساتھ ضرورت سے زیادہ رعایت برتنے کے مترادف ہوگا۔

یہ شعبدہ گری کچھ عورتوں ہی تک محدود نہیں۔ ان عورتوں کے دوش بدوش جو خوش پوش اور خوش حال مرد نظر آتے ہیں ان کو دیکھئے اور سوچئے ان میں کتنے ایسے ہیں جو واقعی اتنے خوش حال ہیں جتنے کہ وہ نظر آتے ہیں۔ اور جو دراصل خوش حال ہیں کیا وہ خود ایک چلتا پھرتا دھوکا اور ایک کھلا ہوا فریب نہیں ہیں؟ اُن کی خوش حالی کی تہہ میں جو منظّم دھوکے بازی ہے وہ کس کی نظر سے پوشیدہ ہے؟ اُن کے چڑھے ہوئے گلوں کی سرخی میں کس کے خون کی جھلک ہے، یہ کون نہیں

جانتا؟ ایسے باعزت لوگوں کی بھی کمی نہیں جن کے چہروں سے علمی وقار، لباس سے متانت، اور پیشانیوں سے تقدس کا اظہار ہوتا ہے مگر اُن میں سے کتنوں ہی کے دماغوں میں فاسد خیالات اور دلوں میں ناپاک ارادے اور گندے ارمان بکھرے ہوں گے۔ لاتعداد چہروں پر ایک پاکیزہ مسکراہٹ پائی جاتی ہے۔ مگر کیا یہ پاکیزہ مسکراہٹ ہمیشہ نفس کی شرافت اور روح کی طہارت کا عکس ہوتی ہے؟ کسی کو کیا معلوم کہ ایک شخص جو سب کے سامنے اپنے ساتھیوں سے حد درجہ نفاست کے ساتھ گفتگو کر رہا ہے، جو ہر لحاظ سے ایک نہایت شریف و مہذب انسان معلوم ہوتا ہے، سیدھا اپنے گھر سے اپنی بیوی کو زدوکوب کر کے چلا آرہا ہے۔ یا آج ہی صبح گھر کے بوڑھے ملازم کو بخار کی دوا کے لئے چند پیسے دینے سے انکار کر چکا ہے۔ پھر کیا وہ سب کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک رہا ہے؟

دھوکا، دھوکا، ہر طرف دھوکا!

اس دھوکے کے ماحول میں جہاں بڑے بڑے خرانٹ نہیں پہچانے جاتے میں نے ایک سیدھی سادھی عورت کو دیکھنے میں دھوکا کھایا تو یہ ایک قدرتی بات تھی۔ میں اُس کو دیکھتا ہوا اور اس کی سادگی اور بے لوثی پر غور کرتا ہوا اس کے برابر سے نکل گیا، مگر عین اسی وقت میں نے دیکھا کہ اس کے پیچھے پیچھے برقع سے لگی ہوئی میری ہفت سالہ بچی ہے، اور اس کے پیچھے گھر کی بوڑھی ملازمہ میرے دو سال کے بچے کو گود میں لئے چلی جا رہی ہے۔ وہ عورت میری بیوی تھی! میں حیرت زدہ ہو گیا اور قدم جہاں تھے وہیں جم کر رہ گئے۔

تیسری ملاقات

(۱۹۴۶ء)

ایک خواب کی روداد سُناتا ہوں۔ اور اگر شروع ہی میں یہ کہدوں کہ یہ ایک غیر معمولی خواب تھا تو اس سے میرا مقصد نہ تو یہ ہوگا کہ پڑھنے والوں کے شوق مطالعہ کو زبردستی بھڑکایا جائے اور نہ یہ کہ خواہ مخواہ رعب گانٹھ کر اپنی یا افسانے کی اہمیت میں اضافہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ یہ محض حقیقت کا اظہار ہوگا۔ اس اظہارِ حقیقت میں مجھے یوں اور بھی کوئی تامّل محسوس نہیں ہوتا کہ اس سے میرے افسانے کی فنّیت کو کسی قسم کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں۔

خواب کی روداد شروع کرنے سے پہلے ایک بات اور بتا دینی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ گو میرا خواب غیر معمولی ہے، مگر میں خود ایک بالکل معمولی یعنی نارمل انسان ہوں۔ یونان کے بوڑھے فلسفی سقراط یا فرانس کی ان پڑھ دیہاتی دوشیزہ جون آف آرک کی طرح میں نے کبھی کوئی غیبی آواز نہیں سُنی۔ میں نے کبھی رات کو نیند کے عالم میں

بستر سے اٹھ کر نہ شیو کیا، نہ سڑک پر چہل قدمی کی، نہ چھت پر سے کودنے کا خطرناک اقدام کیا۔ اور نہ ہارڈی کے ایک ناول کے ہیرو کی طرح اپنی محبوبہ کو بازوؤں میں لیکر گھر سے باہر کی سیر کی۔ میں کبھی کسی دماغی بیماری یا کسی نفسیاتی عدم اعتدال یا کسی قسم کی عارضی یا مستقل دیوانگی ——— مثلاً عشق یا مالیخولیا یا لیٹڑری ——— کا شکار نہیں ہوا۔ میرے ساتھ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے کسی انوکھی یا ان ہونی بات کے ہونے کی خواہش کی ہو اور وہ خواہش ایک معجزانہ انداز میں پوری ہو گئی ہو۔ میں بارہا مصیبتوں میں گھر گھر گیا ہوں۔ مگر کبھی یہ نہیں ہوا کہ خلاف عادت امور کے ذریعہ مجھے مصیبتوں سے چھٹکارا ملا ہو۔ میں نے اکثر ہوائی محل تعمیر کئے ہیں اور بیداری کے خواب دیکھے ہیں، مگر ان خوابوں اور محلوں نے کبھی مادی شکل اختیار نہیں کی۔ مجھے بھوتوں اور آسیبوں سے کبھی سابقہ نہیں پڑا۔ نہ میں نے کبھی اپنی آنکھوں سے کسی جن یا چھلپیری کو دیکھا۔ میں بچپن میں ایک معمولی بچہ تھا، اور طالب علمی کے زمانے میں ایک معمولی طالب علم۔ اپنی زندگی کے کسی دور میں میں نے کسی حیرت انگیز ذہانت یا طباعی کا ثبوت نہیں دیا۔ غرض کہ ہر طرح سے ایک نارمل انسان ہوں اور رہا ہوں۔ سوتے میں جو خواب اکثر دیکھتا ہوں وہ بھی بالکل معمولی آدمیوں کے سے خواب ہوتے ہیں۔ سوا اس ایک بات کے (اور ضروری نہیں کہ یہ بات بھی کوئی غیر معمولی چیز ہو اور دوسروں کو اس کا تجربہ نہ ہوا ہو) کہ میں کبھی کبھی "خواب در خواب" دیکھتا ہوں۔ یعنی خواب میں یہ دیکھتا ہوں کہ میں ابھی سو رہا تھا اور خواب دیکھ رہا تھا اور اب جاگ گیا ہوں۔ اور پھر خواب ہی میں اپنے خواب پر غور کرتا ہوں، اور اپنے آپ سے کہتا ہوں "اُف میں نے کیسا بھیانک خواب دیکھا! کیسا عجیب خواب دیکھا! مگر خیر اب تو میں

جاگ گیا ہوں۔ اب کوئی اندیشے کی بات نہیں۔ آخر وہ محض ایک خواب ہی تو تھا، ایک بے حقیقت خواب ......" یہ ایک قدرے غیر معمولی کیفیت تو ضرور میں نے اپنے خوابوں میں پائی ہے، ورنہ کیا سوتے میں اور کیا جاگتے میں، میرا ذہن بالکل ایک نارمل انسان کے ذہن کی طرح کام کرتا ہے۔

اور اب سنئے میری زندگی کے تنہا غیر معمولی خواب کی روداد!

روز کی طرح اس دن بھی میں نے دوپہر کا زیادہ وقت سونے میں گذارا، اور رات کو ڈیڑھ دو بجے تک اپنے مطالعے کے کمرے میں رہا، جو مکان کے بڑے دروازے کے پہلو میں ہے اور جس کے دروازے اور کھڑکیاں گلی کی جانب ہیں حسب معمول کبھی ایک کرسی پر بیٹھتا، کبھی دوسری پر، اور کبھی کمر سیدھی کرنے کو جی چاہتا تو صوفے پر دراز ہو جاتا۔ اس دوران میں نے پڑھا بھی لکھا بھی، سوچا بھی اور خالی الذہن بھی رہا۔ اور عادت کے مطابق تقریباً مسلسل سگار پیتا رہا، یہاں تک کہ کمرے کی نصف درجن راکھ دانیاں سگار کی راکھ سے اٹ کر رہ گئیں۔ ڈیڑھ اور دو بجے کے درمیان کمرہ بند کرکے گھر کے اندر چلا گیا جہاں برآمدے میں ایک طرف ملازم سو رہا تھا اور دوسری طرف میرا پلنگ بچھا تھا۔ بستر پر پہنچ کر سونے سے پہلے میں نے اس دن کا آخری سگار سلگایا۔ رات اندھیری تھی۔ آسمان ستاروں سے بھرا تھا، مگر ستارے کجلائے ہوئے سے تھے اور ان کی روشنی میں ابھی وہ جگمگاہٹ اور برقیت پیدا نہیں ہوئی تھی جو عام طور پر رات کے آخری حصے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ برآمدے میں قدرتی طور پر صحن سے زیادہ اندھیرا تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے سگار پینے میں کچھ زیادہ لطف نہ آیا۔ سگار کا دھواں جو بجلی کی روشنی میں ایک خاص حسن اور رومانی کیفیت کا حامل نظر آتا ہے

تاریک کثافت کی ایک لہر معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سگار بجھا دیا۔ کلّی کی اور سونے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ عادت کے مطابق فوراً نیند آ گئی اور میں خوابوں کی اُس دُنیا میں پہنچ گیا جس میں ہر شخص اپنی زندگی کا آدھا نہیں تو ایک تہائی حصّہ تو ضرور بسر کرتا ہے۔

اس دنیا میں منتقل ہو کر میں نے دیکھا کہ میرے سامنے صحن کے اُس پار جو دیوار ہے اُس کی منڈیر پہ ایک شخص اکڑوں بیٹھا ہوا ہے۔ وہ کبھی مکان کے مختلف حصّوں پہ طرف نظر دوڑاتا ہے۔ کبھی پیچھے مڑ کر دبی آوازیں اور ہاتھ کے اشاروں کے ساتھ کسی سے باتیں کرتا ہے۔ اور کبھی آگے کی طرف جھک کر صحن کی زمین کی طرف نظر ڈالتا ہے گویا کود کر نیچے آنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ میں اس خوفناک شخص کو دیکھتا ہوں اور اس کے خوفناک ارادوں کو بھانپ کر سر سے پاؤں تک لرز جاتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ بستر سے اٹھوں اور بچاؤ کی کوئی تدبیر کروں، مگر محسوس کرتا ہوں کہ میرے بدن میں ہاتھ پاؤں ہلانے تک کی سکت باقی نہیں ہے۔ میں آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں اور کانوں سے سن سکتا ہوں، مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ ملازم کو جگانے کے لئے آواز دینا چاہتا ہوں، لیکن آواز حلق میں پھنس کر رہ جاتی ہے۔ پھر مجھے خیال آتا ہے کہ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ چنانچہ بار بار پلکیں جھپکاتا ہوں اور متعدد مرتبہ آنکھوں کو بند کر کر کے کھولتا ہوں۔ اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا ہوں، بلکہ میری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور میں حقیقت سے دوچار ہوں۔ اس کے علاوہ میں یہ سوچتا ہوں کہ خواب میں انسان جو کچھ دیکھتا ہے اُس میں اتنی صفائی اور ٹھیٹھ واقعیت کبھی نہیں ہوتی۔ خواب میں ہر چیز دھندلی، الجھی ہوئی، بے ربط، غیر یقینی اور غیر مستقل ہوتی ہے۔

خواب میں تو اکثر یوں ہوتا ہے کہ ابھی آپ اپنے مکان کے اندر کسی پُرتکلف کمرے میں بیٹھے ہوئے لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں، اور ابھی کسی درخت کی ٹہنی پر پہنچ گئے ہیں، یا یہ کہ جس شخص سے آپ الجھ رہے ہیں وہ ابھی آپ کا بھائی ہے اور ابھی ذرا دیر میں آپ کے کسی دوست یا دشمن کا روپ دھار لیتا ہے۔ مگر یہاں صورت حال بالکل مختلف ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے جو منظر ہے وہ بالکل ٹھوس ہے اور واقعیت اور اصلیت سے بھرپور ہے۔ اس منظر کی جزئیات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ میں برآمدے میں اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا ہوں۔ داہنی جانب سرہانے کے پاس چھوٹی میز ہے اور اس پر سگار کیس اور دیا سلائی کا بکس اور پانی سے بھرا ہوا شیشے کا گلاس۔ اسی جانب ذرا آگے بڑھ کر کھانے کی میز اور کرسیاں ہیں۔ اور اُن کے برابر ایک کھلا ہوا شیلف ہے جس میں برتن بھرے ہیں اور جو سائڈ بورڈ یا ویگین کا کام دیتا ہے۔ بائیں طرف دیوار سے لگا ہوا ایک لوہے کا ٹرنک ہے جو معمولی سائز کے آٹھ نو ٹرنکوں کے برابر ہے، اور برآمدے میں اس لئے رکھا ہوا ہے کہ کمرے میں پوری ایک بڑی میز کی جگہ گھیر لیتا ہے۔ ٹرنک کے برابر دو تین کرسیاں پڑی ہیں اور کرسیوں کے اُس طرف ملازم اپنی چارپائی پر بے خبر سو رہا ہے۔ برآمدے کے بعد صحن ہے جس کے چپے چپے سے کیا، ذرّے ذرّے سے مجھے گہری واقفیت ہے، کیونکہ میں اس مکان میں آٹھ دس سال سے رہتا ہوں۔ صحن کے خاتمے پر دس گیارہ فٹ اونچی دیوار ہے جس کی بلندی میں مزید اضافے کے لئے میں ہمیشہ مالک مکان پر ایک بے نتیجہ اور بے سود تقاضہ کرتا رہا ہوں۔ اسی دیوار کے ایک حصے پر کھپریل کا وہ سائبان ٹکا ہوا ہے جو باورچی خانے کو دھوپ اور بارش کے حملوں سے بچاتا ہے اور کھپریل کے برابر دیوار کی منڈیر پر یہ شخص، یہ

بن بلایا مہمان، اکڑوں بیٹھا ہے۔ اور خطرناک ارادوں سے لبریز نظر آتا ہے۔ نہ اس کے حلئے میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے، نہ وہ خود بندر کی شکل میں تبدیل ہوتا ہے۔ اس کا وجود یقینی ہے۔ میں یقیناً خواب نہیں دیکھ رہا ہوں، بلکہ بیدار ہوں ـــــ سوتے سوتے جاگ گیا ہوں اور اس ناخوشگوار صورت حال سے دوچار ہوں۔

اپنی بیداری کا یقین کر لینے کے بعد میں اپنی پھٹی ہوئی آنکھیں منڈیر پہ بیٹھے ہوئے شخص پر جما دیتا ہوں۔ اس کے جسم پر کسے ہوئے لنگوٹ اور ایک چیت شلوکے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ہاتھ اور ٹانگیں بالکل ننگی ہیں۔ سر پہ ایک مٹیالے رنگ کا صافہ بندھا ہے، اور شاید اسی کا کچھ حصّہ ہے جو اُس کے گالوں اور ٹھوڑی کو بھی ڈھانپے ہوئے ہے۔ تاہم اس کا چہرہ یعنی آنکھیں، ناک اور منہ صاف نظر آرہا ہے۔ میں اُس کے چہرے کو غور سے دیکھتا ہوں تو میری حیرت زدگی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ وہ ایک آنکھ سے بھینگا ہے، اُس کا ایک نتھنا بیچ میں سے کٹا ہوا ہے اور پھولے ہوئے ہونٹ دو موٹے موٹے چوہوں کی مانند ہیں۔ میرے ذہن میں ایک بجلی سی کوند جاتی ہے، اور میرا حافظہ چیخ کر کہتا ہے، "بدّو!"

اس مقام پر میں اپنے پڑھنے والوں کو تھوڑی دیر کے لئے خواب کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں واپس لانا چاہتا ہوں۔

میری ساری عمر بڑے بڑے تجارتی اور صنعتی شہروں میں گزری ہے، اور کسی گاؤں یا قصبے میں چند دن گزار دینے کو میں تعطیلات کا بہترین مصرف خیال کرتا ہوں لوگ ایّامِ فرصت میں کلکتہ اور بمبئی یا مسوری اور کشمیر جانے کے پروگرام بناتے ہیں۔ میں اس کے برعکس کسی اداس گاؤں یا ویران قصبے کی طرف نظر دوڑاتا ہوں۔ میرے

اس رجحان کو دیکھتے ہوئے ایک ہم پیشہ وہم مشرب دوست مظہر نے گزشتہ سال کرسمس کی چھٹیوں میں مجھے اپنے گھر چلنے کی دعوت دی۔ یوں میں نے چند روز ایک چھوٹے سے پرسکون قصبے میں بسر کئے۔ مظہر کا مکان جو کچھ خام ہے اور کچھ پختہ، قصبہ کے ایک سرے پر واقع ہے۔ مکان کے ایک طرف ایک کچی سڑک ہے جس پر صبح سے شام تک اونگھتی ہوئی بیل گاڑیاں، بے ضرورت شور کرنے والے یکے، مویشی اور انسان گزرا کرتے ہیں، اور جو اس ہنگامے کے باوجود بے رونق ہی رہتی ہے۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا برساتی تالاب اور اس سے آگے کھیتوں کا لا متناہی سلسلہ ہے مکان کی پشت پر ایک سایہ دار املی کا درخت ہے۔ اسی درخت اور اس کی بہاروں اور اس کے سائے میں برپا ہونے والی صحبتوں کو مظہر نے اپنے قصبے کی سب سے بڑی کشش بتایا تھا۔ شاید اس نے کچھ غلط بھی نہیں کہا تھا۔ کیونکہ میں نے دیکھا کہ آس پاس کے ہر مرتبے اور ہر قماش کے لوگ اپنی فرصت کے اوقات میں یہاں جمع رہتے ہیں، اور ہر وقت اور ہر موسم میں ایک جلسے کا سا سماں بندھا رہتا ہے۔ میرے لئے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہ تھا کہ برسات کے زمانے میں اس درخت کے نیچے بیٹھنا کس قدر لطف و مسرت کا موجب ہوتا ہوگا۔

اپنے چند روزہ قیام کے دوران میں ایک دن جو صبح کو سو کر اٹھا تو دیکھا کہ آسمان پر ابر چھایا ہوا ہے اور ٹھنڈی ہوا غیر معمولی تیزی کے ساتھ چل رہی ہے۔ لیکن اس پر بھی مظہر اور اُس کے چند دوست یا محلے دار درخت کے نیچے حسب معمول جمع تھے۔ کوئی گرم کوٹ پہنے تھا، کوئی کمبل لپیٹے ہوئے تھا اور کوئی لحاف سمیت ہی آنکلا تھا۔ مگر ایسا کوئی نہیں تھا جو سی سی نہ کر رہا ہو اور سردی کے مارے ٹھٹھرا

نہ جاتا ہو۔ سب اس حال میں کھڑے تھے کہ منظہر نے ایک شخص کو جو اُدھر سے گزر رہا تھا بدّو کہہ کر پکارا۔ وہ قریب آیا تو میں نے دیکھا کہ اُس کے بدن پر ایک پھٹی ہوئی گھٹنوں تک اونچی دھوتی اور کھدّر کے ایک کثیف نیم آستین شلوکے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس برہنگی سے زیادہ جاذب توجہ اس کی صورت تھی۔ وہ حد سے زیادہ کریہہ المنظر تھا۔ اس کا سر گنجا تھا، ایک آنکھ بھینگی تھی، ایک نتھنا بیچ میں سے کٹا ہوا تھا، اور ہونٹ دو موٹے موٹے چوہوں کی طرح پھولے ہوئے تھے!

"میاں بدّو! ایسی سردی میں آج صبح ہی صبح کہاں چل دئے؟" کسی نے اُس سے پوچھا۔

"کیا بتاؤں میاں!" اُس نے جواب دیا "مجھ بدبخت کو تو موت بھی نہیں۔ سچ جانیو، آدھی رات سے جب سے کہ ہوا تیز چلی ہے اور بادل ہوئے ہیں صبح تک دونوں میاں بیوی بچی کو بغل میں دبائے، گھٹنوں میں سر دئے بیٹھے رہے ہیں۔"

"پھر اب اتنے سویرے سردی میں کیوں نکل کھڑے ہوئے؟ اس وقت کہاں کا ارادہ ہے؟"

"میاں اویر سویر کی کیا بات ہے۔ یہاں تو ہر وقت سردی ہی ہے۔ رات جس طرح کاٹی ہے بس اپنا ہی دل جانتا ہے۔ اب تمھیں بتاؤ میاں! ایک کھدّر کی چادر اس کڑکڑاتے جاڑے میں کیا کام آسکتی ہے؟ اور وہ بھی تین آدمیوں کے بیچ میں!"

"ہاں بات تو ٹھیک ہے۔ مگر اس وقت جا کہاں رہے ہو؟"

"میاں! جاتا کہاں۔ مزدوری کی فکر ہے۔ آنے دو آنے کی پیداوار کر کے پیٹ کو لگاؤں گا۔"

"اچھا اچھا، جاؤ"، سب نے مل کر کہا۔ اور وہ رخصت ہو گیا۔

یہ میری اور بدّو کی پہلی ملاقات تھی۔

اِس سال ستمبر کے پہلے ہفتے میں منظہر کے کنبے میں ایک شادی تھی، اور مجھے ایک مرتبہ پھر اس کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ کنوار کا مہینہ تھا اور برسات کا آخری زمانہ۔ سب جانتے ہیں کہ اس موسم میں کیسی چلچلاتی دھوپیں پڑتی ہیں۔ صحیح یا غلط مشہور ہے کہ انھیں دھوپوں میں ہرن کالا ہوتا ہے۔ ایک دن یہ اور غضب ہوا کہ ہوا بالکل بند ہو گئی۔ قیامت کی دھوپ اور اس پر حبس! گھروں کے اندر ٹھہرنا ناممکن ہو گیا۔ اگر کہیں کچھ امن تھا تو املی کے درخت کے سائے میں ہی تھا۔ چنانچہ دوپہر کے وقت میں اور منظہر اور کچھ اور لوگ درخت کے نیچے اپنے ہاتھوں میں پنکھے لئے بیٹھے تھے کہ چند مزدور گھاس کے گٹھے سروں پر رکھے آتے ہوئے دکھائی دئے۔ سب کے چہرے گھاس کے گٹھوں میں چھپے ہوئے تھے۔ درخت کے نیچے پہونچ کر سب نے اپنے اپنے سر کا بوجھ زمین پر لڑھکا دیا، اور بیٹھ کر جانوروں کی طرح ہانپنے لگے۔

"کہو بھئی بدو! کیا حال چال ہیں؟"

منظہر کی زبان سے یہ الفاظ سن کر میں نے اپنے حافظے میں ایک ہلکی سی جنبش محسوس کی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا اور بیک نظر اس گنجے سر، اور بھینگی آنکھ، کٹے ہوئے نتھنے اور پھولے ہوئے ہونٹوں والے شخص کو پہچان لیا۔ جس سے پچھلے جاڑوں میں پہلی دفعہ واقفیت حاصل کی تھی۔

"اچھا ہوں میاں!" بدّو نے کہا۔ "اب کے تو میاں تم بہت دنوں میں گھر کو آئے۔"

"ہاں بھئی، کیا بتائیں چھٹی نہیں ملتی۔ کہو اب تمہاری کیسی گزر رہی ہے؟ جاڑوں میں تو تم بڑی تکلیف اٹھا رہے تھے۔"

"میاں ہم غریب کے لئے جاڑا گرمی سب برابر ہے۔ جاڑوں میں سردی کے مارے اکڑے جاتے تھے اور اب گرمی میں یہ دھوپ جلائے ڈالتی ہے۔ لو دیکھو۔"

یہ کہہ کر بدّو نے اپنی پشت ہماری طرف کی، اور ہم نے دیکھا کہ اس کی پشت پر چوّنی کی گولائی کے برابر بیسیوں آبلے پڑے ہوئے ہیں۔

"یہ آبلے کیسے؟" مظہر نے پوچھا "کیا کہیں جل گئے؟"

"میاں! جل نہیں گئے،" بدّو بولا "کپاس کے کھیت میں بیٹھے گھاس صاف کر رہے تھے۔ اپنے پاس کوئی کپڑا تھا نہیں جو پیٹھ پر ڈال لیتے۔ دھوپ کی تیزی سے آبلے پڑ گئے ہیں۔"

مظہر اور اس کے ساتھی "ارے" کہہ کر خاموش ہو گئے اور آسمان کی طرف منہ کر کے بارش کی دعائیں مانگنے لگے۔

یہ میری اور بدّو کی دوسری ملاقات تھی!

اور تیسری ملاقات خواب کی دنیا میں ہوئی جس کی روداد کا ایک حصّہ میں سنا چکا ہوں اور باقی حصے کی طرف اب متوجہ ہوتا ہوں۔

میں منڈیر پر بیٹھے ہوئے شخص کو پہچان لیتا ہوں، اور زور سے چیخ کر کہنا چاہتا ہوں، "بدّو! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیا تم مجھے نہیں پہچانتے؟" مگر آواز حلق سے نہیں نکلتی، اور میں بے دست و پائی کے عالم میں اس کو دیکھتے رہنے پر مجبور ہوں۔ اتنے میں ایک اور شخص کا سر منڈیر سے اونچا ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور ایک لمحے میں وہ

بھی بدو کے برابر آن بیٹھتا ہے۔ میں صورت حال کی اس ارتقائی تبدیلی پر پوری طرح غور بھی نہیں کر پاتا ہوں کہ اسی طرح ایک تیسرا شخص دیوار کے پیچھے سے نمودار ہوتا ہے اور منڈیر پر آکر اپنے ساتھیوں کے پہلو میں بیٹھ جاتا ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا دیوار کے اس طرف زمین شق ہو گئی ہے اور کسی غلیظ اور ملعون دنیا کے بسنے والے اپنے ناپاک مسکنوں سے نکل نکل کر میرے مکان پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ میں اپنی نظریں یہ دیکھنے کے لئے منڈیر پر جما دیتا ہوں کہ ان تین حملہ آوروں میں اور کتنے حملہ آوروں کا اضافہ ہونے والا ہے۔ یا اسے یہ اضافہ تو نہیں ہوتا، مگر یہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ تینوں شخص کھپریل کے سائبان کا سہارا لیتے ہوئے یکے بعد دیگرے نیچے صحن میں اتر آتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر چیخنے کی کوشش کرتا ہوں، اور پلنگ سے اٹھنے کے لئے اپنے جسم کی انتہائی قوت کو کام میں لاتا ہوں۔ مگر کامیابی نہیں ہوتی۔ میری آواز میرے دماغ میں گونج کر رہ جاتی ہے اور میرے جسم کی قوت تحلیل ہو کر مجھے پہلے سے زیادہ مفلوج بنا دیتی ہے۔ وہ تینوں شخص آگے پیچھے ایک قطار سی باندھے ہوئے مکان کے بڑے دروازے کی طرف جاتے ہیں۔ دروازہ کھلنے کی آواز مجھے سنائی دیتی ہے۔ وہ دروازے کو چوپٹ کھول دیتے ہیں، گویا فرار کے راستہ کا انتظام سب سے پہلے کرتے ہیں۔ اس انتظام سے فارغ ہو کر تینوں دوبارہ صحن میں آجاتے ہیں۔ تھوڑی دیر متامل رہتے ہیں اور آپس میں اشاروں سے باتیں کرتے ہیں۔ اس کے بعد برآمدے کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ میں برق زدہ ہو کر رہ گیا ہوں۔ میری حالت بیہوشی کی حالت سے کہیں بدتر ہے، کیونکہ بیہوشی میں انسان شعوری احساس سے بہر حال عاری ہوتا ہے۔ برآمدے میں لوہے کا ضخیم ٹرنک سب سے پہلے ان کی توجہ کا مرکز بنتا ہے۔ وہ

کچھ دیر تک جھک جھک کر اُس کے قفل کو دیکھتے ہیں۔ شاید کوئی کام بنتا نظر نہیں آتا۔
اس لئے کمرے کی دروازے کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس دروازے میں بھی ایک قفل پڑا
ہوا ہے۔ چنانچہ اِدھر سے بھی پسپا ہوتے ہیں، اور تینوں برآمدے سے نکل کر صحن میں
چلے جاتے ہیں۔ تقریباً دو منٹ تک کھپریل کے سائبان کے نیچے کھڑے رہتے ہیں۔
اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں اور آپس میں مشورہ کرتے ہیں۔ اس کے بعد دوبارہ برآمدے
کی طرف بڑھتے ہیں۔ میں ایک مرتبہ پھر چیخنے کی اور پلنگ سے اٹھنے کی زبردست
کوشش کرتا ہوں، مگر آواز میرے حلق میں مرچکی ہے اور بستر میرے لئے قبر بن کر
رہ گیا ہے۔ ایک شخص ملازم کی چارپائی کی طرف بڑھتا ہے اور اس کے قریب جاکر کھڑا
ہو جاتا ہے۔ دوسرا برآمدے کے بیچ میں ٹھہر جاتا ہے۔ اور تیسرا یعنی بدّو میرے
پلنگ کی طرف اپنے قدم بڑھاتا ہے۔ وہ میرے سرہانے کے پاس پہونچ کر چند لمحوں
تک بے حس و حرکت کھڑا رہتا ہے۔ اس کے بعد آگے کو جھکتا ہے اور میرے چہرے
کو بغور دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں چیخنے کی ایک آخری اور بے پناہ کوشش کرتا
ہوں اور کامیاب ہوتا ہوں۔

ایک بھیانک چیخ کے ساتھ میری آنکھ کھل جاتی ہے۔ میں خواب کی دنیا، بلکہ
یوں کہنا چاہئیے کہ خواب کے تاریک غار سے نکل کر حقیقت کی دنیا میں آجاتا ہوں۔

اور یہ تھا وہ خواب جو میں نے دیکھا۔

"لیکن"، آپ کہیں گے، "یہ تو بالکل معمولی خواب تھا۔"

ممکن ہے آپ کا خیال صحیح ہو، مگر جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ ایک
شخص میرے سرہانے کھڑا ہے اور جھک کر میرے چہرے کو بغور دیکھنے کی کوشش

کر رہا ہے۔ وہ ایک آنکھ سے بھینگا تھا۔ اس کا ایک نتھنا بیچ میں سے کٹا ہوا تھا اور
اس کے پھولے ہوئے ہونٹ دو موٹے چوہوں کی مانند تھے۔ وہ بدّو تھا!

دریا کی سیر

(۱۹۴۲ء)

"آپ مسٹر شرما ہیں ـــــ ہمارے ای۔ او!" ظہیر بھائی نے میرا اور اپنے اگزیکٹو آفیسر کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

شرما جی نے اپنی کرسی سے اٹھنے کی ایک خفیف سی کوشش کرتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولے، "مزاج گرامی!"

"آپ سے مل کر بے حد مسرت ہوئی!" میں نے کہا۔

"معاف کیجئے گا،" وہ بولے، "میں آپ سے گھر پر جا کر ملاقات نہیں کر سکا ظہیر سے معلوم ہوا تھا کہ آپ آئے ہوئے ہیں۔ مگر میری طبیعت اچھی نہیں تھی۔"

یہ کہہ کر وہ ظہیر بھائی سے اپنے کسی پوشیدہ مرض کا ذکر کرنے لگے اور کچھ دیر تک بیماری کے تازہ ترین حملے کی تباہ کاریوں پر اظہار خیال ہوتا رہا۔

اور اس میں شک نہیں کہ وہ بیمار تھے۔ ان کا چہرہ جو غالباً تندرستی کی حالت میں

سرخ و سپید ہوتا زرد ہو رہا تھا۔ آواز میں ایک قدرتی لوچ اور گھلاوٹ کے ساتھ ساتھ نقاہت کا اثر بھی پایا جاتا تھا۔ آنکھوں میں جوانی کی چمک تھی، مگر ہونٹوں کی پھیکی اور مرجھائی ہوئی مسکراہٹ صاف طور پر کسی اندرونی آزار کا عکس معلوم ہوتی تھی۔

وہ جلد ہی مجھ سے دوبارہ مخاطب ہو گئے "تو آپ نیشنل گزٹ کے ایڈیٹر ہیں دہلی میں؟"

"جی نہیں، میں ایڈیٹر نہیں ہوں ——"

"سب ایڈیٹر؟"

"جی —— سب ایڈیٹر بھی نہیں۔ میں اصل میں اُس کے اندر مضامین لکھا کرتا ہوں اور کبھی کبھی دفتر کا کوئی عارضی کام بھی مجھے مل جاتا ہے ——"

شرما جی نے تیزی سے ظہیر بھائی کی طرف دیکھا۔ اور پھر میں نے بھی ظہیر بھائی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

"اوفوہ کس قدر گرمی ہے!" ظہیر بھائی نے گفتگو کا رُخ بدلنے کے لئے کہا، اور چھت کی طرف منہ کر کے پنکھے کو دیکھنے لگے۔

"چپراسی!" شرما جی اپنی لطیف رسیلی آواز کو زیادہ سے زیادہ کرخت بنا کر چلائے، "پنکھا کو بلاؤ، پنکھا کھینچے۔" اور پھر چہرے پر شدید غصّے کے آثار پیدا کر کے بولے، "یہ کیوں نہیں آئی ابھی تک حرام زادی ہ"۔ لیکن چپراسی ان کا حکم سنتے ہی دوڑ پڑا تھا۔ اور اس سوال کا جواب دینے کے لئے وہاں موجود نہ تھا۔

شرما جی کا "موڈ" بدل گیا۔ اب وہ غیر متعلق، رسمی اور تعارفی گفتگو میں وقت ضائع کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ چنانچہ زرد کاغذات کے ایک ڈھیر کو میز کے سرے

سے اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے بولے "بھئی ظہیر! اب ذرا سا کام کر لیں۔ ورنہ پھر وہ لوگ آجائیں گے۔ چمن صاحب تو بس اب آیا ہی چاہتے ہیں۔ تم نے اُن سے کہلوا دیا تھا نا کہ آٹھ بجے تک ضرور آجائیگا؟"

"جی ہاں، میں نے کہلوا دیا تھا"، ظہیر بھائی نے جواب دیا۔ "آپ اپنا کام سمیٹ لیجئے۔"

"کیوں صاحب اجازت ہے نا؟" شرما جی مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"جی ہاں، ضرور، ضرور!"

"صرف چند منٹوں کا کام ہے۔ پھر تو سارا دن آپ کے ساتھ گزارنا ہے۔" اور یہ کہہ کر وہ اپنے کاغذات کی دیکھ بھال میں لگ گئے۔

ظہیر بھائی نے بھی ایک موٹا سا فائل اٹھالیا اور اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔

اب رہ گیا میں۔ تو میرے پاس سوچنے اور غور کرنے کے لئے بہت کافی مواد تھا۔

"میں اس زرد رُو، بابو قسم کے انسان کے ساتھ سارا دن کیونکر گزاروں گا؟"

میں نے اپنے دل میں خیال کیا۔ "اس میں اور مجھ میں تو کوئی چیز مشترک نہیں۔ یوں تو خاصا بھلا آدمی معلوم ہوتا ہے، مگر اِس کو دیکھ کر اور اِس سے باتیں کر کے طبیعت میں ذرا بھی تو ولولہ پیدا نہیں ہوتا۔ ایک عجیب سی افسردگی دل پہ چھائی جا رہی ہے۔ دیکھئے یہ طول طویل دن کس طرح کٹتا ہے۔ اچھی مصیبت میں پھنسایا ظہیر بھائی نے! دریا کی سیر! کیا خوب! ایک پھیکے میٹھے، بے مزہ اور زرد رُو بابو کے ساتھ کیا خاک دریا کی سیر ہوگی! لیکن اِس بیچارے کو بابو کیوں کہو؟ یہ تو ایک طرح سے حاکم ہے۔

اگزیکٹو آفیسر! اور بابو ہی سہی، آدمی تو بُرا نہیں۔ ہاں ایک ذرا بے جان سا بیمار سا آدمی ہے جو زندگی کے جوش وخروش کے قبل از وقت محروم ہو گیا ہے۔ پھر بھی یہ امید کرنا بیکار ہی ہے کہ اس کے ساتھ دریا کی سیر کوئی مسرت بخش مشغلہ ثابت ہو گی اور ابھی تو ایک ہی صاحب سے ملاقات ہوئی ہے۔ دیکھئے وہ چیرمین صاحب کس قسم کے آدمی نکلتے ہیں۔ اور ہاں وہ قیوم صاحب! لکھنو کے تعلقدار ہیں وہ! ان کی ایک یہی خصوصیت انھیں نفرت انگیز بنا دینے کے لئے کافی ہے۔ بڑی سی توند ہو گی اور چھوٹا سا دماغ! لکھنو سے اپنی کار میں آئے ہیں۔ چلو آج ہم بھی ان کی کار میں بیٹھ لیں گے۔ دریا کی سیر میں لطف آئے یا نہ آئے، مگر یہاں سے وہاں تک کا سفر لطف دے جائے گا۔ بشرطیکہ کار عمدہ قسم کی ہوئی۔ لیکن یہ چمن صاحب کون ہیں جن کے متعلق ابھی انھوں نے کہا تھا کہ آنے ہی والے ہیں؟ کیا یہ حضرت بھی ہمارے ساتھ دریا کی سیر کو جائیں گے؟ ظہیر بھائی نے تو اِن کا ذکر کیا نہیں۔"

میں چمن صاحب کے مسئلے پر زیادہ غور نہ کر سکا کیونکہ عین اُس وقت میری آنکھوں کے سامنے ایک بجلی سی کوندی، اور نہ صرف میرے خیالات کا سلسلہ رُک گیا، بلکہ چند لمحوں کے لئے میں یہ بھی بھول گیا کہ مَیں کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔

اُس دروازے میں سے جو میرے اور ظہیر بھائی کے بالکل سامنے تھا اور جس کی طرف شرماجی پشت کئے ہوئے بیٹھے تھے ایک ایسی سیم تن اور گُل عذار دوشیزہ کمرے میں داخل ہوئی جس کو یقیناً "چاند کا ٹکڑا"، یا "نور کا جھمکڑا"، کہا جا سکتا تھا۔ اُس کو دیکھ کر میرے دل میں یک لخت ہالی وُڈ کی سحر طراز ایکٹرس شرلے ٹمپل کی یاد تازہ ہو گئی۔ وہی جوانی کی شراب میں نہایا ہوا پیکر مرمریں، وہی آتش کدے کی طرح

دمکتا ہوا چہرہ، وہی آفتاب کی کرنوں سے بنی ہوئی پیشانی، وہی کھلے ہوئے گلاب کی سی شگفتگی رکھنے والے ہونٹ، وہی جگمگاتی ہوئی برق پاش آنکھیں، وہی نقوش، وہی انداز، وہی ادا، ایسا معلوم ہوا گویا پردۂ سیمیں پر شرلے ٹمپل کسی بے حد حسین مگر نہایت بدذوق ہندی دوشیزہ کا پارٹ ادا کر رہی ہے۔ بدذوق اس لئے کہ جہاں تک لباس اور ظاہری آرائش کا تعلق ہے، وہ ہر قسم کے ذوق صحیح سے یکسر بیگانہ تھی۔ اس کو بدذوقی کے سوا اور کس چیز سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ اُس کے جسم پر کپڑوں کی بجائے صرف چیتھڑے اور دھجیاں تھیں جن میں جابجا لاتعداد گرہیں لگی ہوئی تھیں تاکہ وہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو کر زمین پر نہ گر پڑیں اور جسم پر قائم رہیں؟ یہ سچ ہے کہ اس پیرہن تار تار میں سے اس کا پارۂ قمر جسم اس طرح چمک رہا تھا جس طرح بعض اوقات برسات کی رات میں سیاہ بادلوں کے اندر سے ستارے چمکا کرتے ہیں۔ مگر چونکہ اس ادائے جمیل میں اُس کی ذاتی کوشش کو کوئی خاص دخل نہیں تھا، اس لئے اس چیز کی بنا پر وہ بدذوقی کے الزام سے بری نہیں ہوسکتی تھی۔

اُس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پنکھے کی ڈوری ہاتھ میں لی اور کھینچنا شروع کردیا۔ مجھے یہ نتیجہ نکالنے میں کسی خاص قوت استدلال سے کام نہیں لینا پڑا کہ یہ نوعمر اور بدذوق دوشیزہ شرلے ٹمپل نہیں بلکہ مینا ہے جس کو ذرا دیر پہلے شرما جی نے بڑے جوش وخروش کے ساتھ یاد فرمایا تھا۔

شرما جی اپنے سر پہ پنکھے کو ہلتا ہوا دیکھ کر فوراً پیچھے مڑے اور اپنی نرم و نازک آواز میں ایک مصنوعی کڑک پیدا کر کے بولے "کیوں رمی، کہاں تھی اب تک؟"

ینا کے حسن کا آتش زار جسطرح دہک رہا تھا اسی طرح دہکتا رہا۔ اُس کی آفتاب کی کرنوں سے بنی ہوئی پیشانی پر ایک بل بھی نہیں پڑا۔ اُس کی جگمگاتی ہوئی آنکھوں کی جوت میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ وہ غالباً اِس قسم کی ڈانٹ کو سننے اور اُس کو نظر انداز کر دینے کی عادی ہو چکی تھی۔

"بولتی کیوں نہیں ؟" شرماجی نے زیادہ زور سے چیخ کر کہا "کہاں تھی اب تک ؟"

وہ اب بھی غیر متاثر رہی۔

شرماجی آپے سے باہر ہو گئے۔ خوب چیخے۔ خوب چلائے۔ کئی دفعہ اپنی کرسی سے اٹھتے اٹھتے رہ گئے۔ اور آخر کار یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے کہ چونکہ وہ آٹا گوندھ رہی تھی اس لئے جلد تر نہ آسکی۔

"یاد رکھیو، تجھی کو نہیں، تیرے باپ کو بھی یہاں سے نکال باہر کروں گا، اور اس چھپر میں آگ لگوا دوں گا۔" اِس آخری تہدید کے بعد وہ پھر اپنے کاغذات کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔

پرانی وضع کے ڈراموں میں ایک الم ناک منظر کے بعد بسا اوقات ایک طربیہ سین ہوا کرتا ہے۔ ظہیر بھائی نے اِسی فن کارانہ اصول کی پیروی کی۔ شرماجی کی حد سے زیادہ سنجیدہ ڈانٹ ڈپٹ کے بعد انھوں نے تھوڑی سی چہل کو غیر مناسب اور بے موقع نہ سمجھا۔

"کیوں رے چوہے کھانی !" انھوں نے مینا سے کہا، "تو بہت نکمی ہو گئی ہے اب ! کیا چوہے کھانے کو نہیں ملتے ؟"

مینا نے جس طرح شرماجی کے غصّے کو نظر انداز کیا تھا، اُسی طرح ظہیر بھائی کی چہل

کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اصل یہ ہے کہ مزاح سے لطف اندوز ہونا ہر کس وناکس کا کام نہیں، اور ظہیر بھائی کو ایک بد مذاق لڑکی سے اس سلسلے میں یقیناً کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیئے تھی۔

گھر میں اگر کسی چھوٹی بچی کو چھیڑنا ہوتا ہے تو اکثر اُسے چوہے کھائی کہہ دیا کرتے ہیں۔ یہ گویا ایک پیار کا لفظ ہے۔ مگر یہاں میں یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ ظہیر بھائی نے کس خیال کے ماتحت بینا کو چوہے کھائی کہہ کر پکارا۔ میں اُن سے پوچھنے والا ہی تھا کہ شرما جی نے برابر والے کمرے کی طرف دیکھا اور بولے، " ٹلر صاحب! ٹیکوں کا رجسٹر لائیے۔"

میں اچھل پڑا۔ ہندستان کے ایک چھوٹے سے قصبے میں ٹلر جیسی شخصیت کا موجود ہونا بلاشبہ ایک حیرت میں ڈال دینے والی بات ہے۔ میں تین دن بیشتر اپنے اخبار اور صحافتی ماحول کو خیرباد کہہ کر دہلی سے روانہ ہوا تھا تو میں نے سوچا تھا کہ کم سے کم چند دن تو ٹلر اور ٹلر بیت کے ناپاک غلغلے سے دور رہوں گا۔ مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ جنگ واقعی ایک عالم گیر چیز ہے اور اس وسیع و بسیط دنیا کا حقیر ترین گوشہ بھی اُس کے ہمہ جہت اثرات سے محفوظ نہیں ہے۔

برابر والے کمرے میں سے ایک صاحب جن کی کمر جھکی ہوئی تھی، جن کی داڑھی سفید تھی ــــ جن کا شکستہ وجود زندگی کے تقریباً ساٹھ سالوں کے بوجھ کے نیچے بُری طرح کراہ رہا تھا ــــ ایک عظیم الہیئت رجسٹر اپنے دونوں ہاتھوں میں اُٹھائے ہوئے تشریف لائے۔

میں ٹلر اعظم کے اِس عجیب وغریب نمونے کو دیکھ کر سخت متعجب ہوا۔

ٹلر صاحب نے رجسٹر کھول کر شرماجی کے سامنے میز پر رکھا تو میز کا بڑا حصہ ہماری نظروں سے روپوش ہو گیا۔

"لیکن ان صاحب کا نام ٹلر پڑا کیونکر؟" میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "ان میں اور قائدِ جرمنی میں تو ذرا سی بھی مشابہت نظر نہیں آتی۔ مگر نہیں! مشابہت ہے، بشرطیکہ ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے۔ ٹلر کو ایک بوڑھے انسان کے سوا کسی اور چیز سے تعبیر کیا ہی نہیں جا سکتا، اِس لئے کہ وہ مجسمہ ہے ایک بوڑھے فرسودہ نظام کا جو اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا ہے......"

میرا سیاسی فلسفہ کچھ بے محل ہی ثابت ہوا۔ کیونکہ اُسی وقت ظہیر بھائی بڑے میاں کی جانب متوجہ ہوئے اور بولے، "کہئے ہیڈ کلرک صاحب! اُس خط کا کوئی جواب آیا یا نہیں؟"

گویا بڑے میاں دراصل "ہیڈ کلرک صاحب" تھے اور یہ محض شرماجی کی زبان کے فطری لوچ کا نتیجہ تھا کہ میں اُنھیں "ٹلر صاحب" سمجھ بیٹھا۔ میں شرماجی کی گویائی اور اپنے سامعہ کی اس دلچسپ سازش پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

شرماجی ٹیکوں کے رجسٹر پر بُری طرح جھکے ہوئے تھے۔ میری نظر ان کی کرسی کی "بیک" پر پڑی، یعنی اُس حصے پر جو بیٹھنے والے کی پیٹھ کو سہارا دیتا ہے۔ وہ کرسی اپنی ساخت کے لحاظ سے "آفس چیئر" نہیں تھی، بلکہ "ڈائننگ چیئر" تھی۔ جن کرسیوں پر میں اور ظہیر بھائی بیٹھے ہوئے تھے وہ بھی اسی قسم کی تھیں۔ اب میز پر جو نظر کی تو معلوم ہوا کہ وہ بھی "ڈائننگ ٹیبل" ہے۔ غرضکہ کل فرنیچر ڈائننگ روم کا فرنیچر تھا۔ ان حالات میں اگر شرماجی قمیص کی جگہ پتلون پہنے ہوئے ہوتے تو کچھ زیادہ نامناسب نہ ہوتا۔ میں نے کمرے میں اِدھر

اُدھر نظر دوڑائی کہ شاید کسی کونے میں ایک آدھ "سائڈ بورڈ"، ایک آدھ "ویگن"، اور چند ٹوٹے پھوٹے برتن بھی رکھے ہوئے دکھائی دے جائیں۔ یہ چیزیں تو مجھے نظر نہ آئیں، البتہ کمرے کی ویرانی کا کچھ اندازہ ہو گیا۔ الماریاں دروازوں سے محروم تھیں اور اُن کے اندر مکڑیوں نے کثرت کے ساتھ جالے بُن رکھے تھے۔ دیواروں پر گرد کی موٹی سی تہہ جمی ہوئی تھی۔ چھت مٹی کا ایک ڈھیر تھی۔ فرش بالکل کچا تھا۔ میونسپل آفس کیا تھا سچ مچ ریلوے کے مال گودام کا دفتر تھا۔

شرما جی اپنا کام کر چکے اور فراغت کے انداز سے کرسی پر پھیل کر بیٹھ گئے پھر انہوں نے گھڑی دیکھی اور ظہیر بھائی سے بولے، "ابھی تک تو آئے نہیں جمن صاحب ساڑھے آٹھ بج رہے ہیں۔"

"ای۔ او صاحب! میرے خیال میں آپ جا کر اُن کو لے آیئے،" ظہیر بھائی نے کہا "آپ کا ٹانگہ تو کھڑا ہی ہے ــــ یا آپ کہیں تو میں چلا جاؤں۔"

"نہیں، میں خود جاتا ہوں۔ ذرا یہ بھی دیکھتا آؤں گا کہ کھانے کا کیا انتظام ہوا ہے ــــ کیا کیا چیز پکی ہے۔" اُن کی زبان ابھی سے چٹخارے لے رہی تھی۔

"کیا کیا چیز کا تو کوئی سوال ہی نہیں،" ظہیر بھائی بولے، "وہ تو کل ہی طے ہو گیا تھا۔ شامی کباب اور پراٹھے اور تلی ہوئی مچھلی۔"

"اور آم؟"

"آم قیوم صاحب لا رہے ہیں۔"

شرما جی کے چہرے پہ اطمینان اور مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ان لذائذ کا تصور کر کے میرے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔

ہم تینوں اُٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے سے باہر جانے لگے۔ چلتے چلتے میں نے مینا پر ایک نظر ڈالی۔ اُس نے میری توجہ کو لائق توجہ نہیں سمجھا۔

شرما جی تانگے پہ بیٹھ کر جمن صاحب کو لینے چلے گئے۔

ظہیر بھائی نے مجھ سے کہا: "آؤ میرے دفتر میں چلو۔"

برآمدے میں سے گزرتے وقت میں نے دیکھا کہ سامنے درخت کے نیچے ایک شخص بیٹھا ہوا ہے اور اُس کی ناک سے گاڑھا گاڑھا خون نکل کر لوتھڑوں کی شکل میں زمین پر جمع ہو رہا ہے۔ ظہیر بھائی اُس شخص کو دیکھتے ہی چلائے، "ارے بشیر! آج تُو نے اسی۔ او صاحب کے دفتر میں چھڑکاؤ نہیں کیا؟ تمام خاک اڑ رہی ہے۔ یہ کیا تیری نکسیر پھوٹ گئی؟ چل جلدی دفتر میں چھڑکاؤ کر۔ اور برآمدے میں بھی دو چار مشکیں بہا دے۔" یہ کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے۔ اس وقت وہ ذرا جلدی میں تھے، کیونکہ مجھے اپنا دفتر دکھانے لے جا رہے تھے۔

برآمدے کے ایک پہلو میں ان کا دفتر تھا۔ اس میں کوئی قابل دید چیز نہ تھی ایک چھوٹی سی میز، اُس پر تھوڑے سے کاغذات اور بہت سی خاک دھول، میز کے گرد دو تین پرانی کرسیاں جن پر مدتوں کے استعمال سے خود بخود ایک سیاہ رنگ کا پالش ہو گیا تھا، اور کمرے کے ایک گوشے میں ٹوٹی لالٹینوں کا ایک ڈھیر ـــــ یہ تھی کل کائنات ظہیر بھائی کے دفتر کی!

"ظہیر بھائی!" میں نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا، "یہ تو بتائیے کون کون چل رہا ہے سیر کو؟"

"بس ہمارے علاوہ اے۔ او صاحب ہیں، اور چیرمین صاحب اور قیوم صاحب!"

"اور چمپن صاحب؟"

"کون چمپن صاحب؟" انھوں نے چونک کر پوچھا۔

"کون چمپن صاحب!" میں نے حیرت کے ساتھ اُن کے الفاظ کو دہرایا۔ "آپ نہیں جانتے چمپن صاحب کو؟"

"ارے بھئی! کون چمپن صاحب؟ کچھ معلوم تو ہو۔"

"بھئی واہ!" میں نے کہا، "بڑی عجیب بات ہے! اور یہ آپ کے ای۔ او صاحب ابھی کیا کہہ رہے تھے کہ چمپن صاحب ابھی تک نہیں آئے؟——"

"چمپن صاحب نہیں،" انھوں نے "نہیں" پر زور دے کر کہا، "چیرمین صاحب!"

"لاحول ولا قوۃ!" میرے منہ سے نکلا اور میں کچھ جھینپ سا گیا۔

یہ شرماجی کی گویائی اور میرے سامعہ کی ایک اور دلچسپ سازش تھی۔ اس سازش میں زیادہ شرارت شرماجی کی گویائی کی تھی۔ میرے سامعہ کا قصور اگر کچھ تھا تو بہت معمولی۔ مگر شرمندگی مجھی کو اٹھانی پڑی۔

ایک میلے کچیلے مزدور نے اندر آکر قصبے کی روشنیوں کے متعلق ظہیر بھائی سے کچھ باتیں شروع کر دیں۔ میں موقع پاکر کمرے میں سے نکل بھاگا۔ باہر زمین پر سبز گھاس کا ایک نرم و نازک فرش بچھا ہوا تھا۔ آسمان پہ بادل چھائے ہوئے تھے، اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بھیگی ہوئی زمین کی سوندھی سوندھی خوشبو سے گراں بار تھے۔ میں نے وہیں کچھ دیر ٹہلنے کی ٹھانی۔ یہ پُر بہار جگہ میونسپل آفس کی پشت پر تھی۔ ظہیر بھائی کے دفتر کے نیچے پیچھے ایک جھونپڑا سا بنا ہوا تھا جس کی کچی دیواریں گز گز بھر سے زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ دیواروں کے اوپر ایک پھونس کا چھپر تھا۔ میں ٹہلتا ہوا آگے بڑھا تو دیکھا

کہ جھونپڑے کے سامنے ایک نیم کے درخت کے نیچے مینا بیٹھی ہوئی روٹی پکا رہی ہے۔
اُس نے مجھے دیکھنے کے باوجود بھی نہیں دیکھا۔ اُس کے اسی بے پناہ استغنا نے مجھے جرات دلائی کہ میں ڈھٹائی کے ساتھ وہیں ٹہلتا رہوں اور گھور گھور کر اُسے دیکھے جاؤں۔
چولھے سے ذرا فاصلے پر ایک سیاہ فام ادھیڑ عمر کا آدمی جس کا جسم قریب ننگا تھا، ایک چلم منہ سے لگائے بیٹھا تھا۔ وہ مینا کا باپ تھا جس کو ذرا دیر پہلے شرما جی نے برخاست کر دینے کی دھمکی دی تھی۔ اُس کی للچائی ہوئی نظریں سختی کے ساتھ روٹیوں پر گڑی ہوئی تھیں۔ روٹیوں کی شکل نہایت مکروہ تھی۔ مجھے بے اختیار وہ کباب پراٹھے یاد آگئے جو ہم لوگوں کے لئے چیرمین صاحب کے یہاں سے تیار ہو کر آرہے تھے۔ اور جن کا ذکر چند منٹ پیشتر ظہیر بھائی نے کیا تھا۔ مگر اُس وقت میرے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ اس وقت ایسا نہیں ہوا۔ معلوم نہیں کیوں!
میں نے کوشش کر کے مینا کی روٹیوں کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا۔ اور چیرمین صاحب کے ہاں کے کباب پراٹھوں کو بھی دل سے بھلا دیا۔ میری توجہ خود بخود اُس عجیب و غریب مرقع میں جذب ہو گئی جس کا پس منظر مجموعہ تھا ایک غلیظ جھونپڑے اور ایک غلیظ شخص کا، اور پیش منظر عبارت تھا ایک جلوۂ قمر دوشیزہ سے۔ یہ مرقع اس قدر چابک دستی سے تیار کیا گیا تھا اور اس کے نقوش سے ہماری زندگی کی ایسی ظالمانہ نقاب کشائی ہوتی تھی کہ کچھ دیر کے لئے میں بالکل مبہوت ہو گیا۔
مینا نے روٹیاں پکا کر باپ کے سامنے رکھ دیں۔ باپ نے چلم منہ سے ہٹائے بغیر اُس سے کچھ کہا۔ اس پر وہ اندر گئی اور ایک چھوٹی سی غلیظ تپیلی اور میلی سی بوتل نکال کر لائی۔ دنیا کی دنیا میں اُس کے چہرے کے سوا کہ وہ آفتاب کی طرح بے داغ تھا ہر چیز غلیظ

ادھیلی تھی!) اُس نے پتیلی چولھے پر رکھی اور بوتل میں سے کوئی رقیق چیز جو غالباً کسی نہ کسی قسم کا تیل ہوگا اُس کے اندر انڈیل دی۔ پھر اُس نے چولھے کی آگ کو تیز کیا۔ اور اس کے بعد...... میں سمجھا کہ اب یہ میری طرف آرہی ہے۔ مگر نہیں! اس کی نظروں میں میرا تو کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ وہ میرے برابر سے اس طور سے نکل گئی گویا اس کے نزدیک میں اُن جانوروں میں سے تھا جو میرے قریب ہی گھاس چر رہے تھے۔ وہ سیدھی دیوار تک گئی جس کی جڑیں برسات کے موسم کی مخصوص گھاس کثرت کے ساتھ اُگی ہوئی تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے تھوڑی سی گھاس نوچی اور اس کو لئے ہوئے واپس ہوئی۔ میں اپنی چہل قدمی بھول چکا تھا اور ایک جگہ پر کھڑا ہوا ٹکٹکی باندھ کر اُس کو دیکھ رہا تھا۔ حیرت کے سبب سے میری آنکھیں اس قدر پھٹی ہوئی تھیں کہ میرا خیال ہے اگر وہ میری طرف دیکھتی تو اُس کو میرے چہرے پر آنکھوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آتا۔ لیکن اُس نے میری طرف نہیں دیکھا۔ سیدھی چولھے کے پاس گئی اور گھاس کو پتیلی میں ڈال دیا۔ ایک کفگیر ہاتھ میں لے کر زیادہ سے زیادہ ایک منٹ تک اُس کو چلایا۔ اس کے بعد پتیلی کو چولھے سے اُتارا اور لے جاکر باپ کے سامنے رکھ دیا۔

میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ مرقع کی یہ تازہ ترین رنگ آمیزی میرے ذوق سے بالاتر چیز تھی۔ دوڑ کر ظہیر بھائی کے دفتر میں پہنچا۔ وہ خالی تھا۔ آگے بڑھا تو برآمدے میں ظہیر بھائی کو ایک بہت کم عمر نوجوان کے ساتھ ایک آموں کی ٹوکری پر جھکا ہوا پایا۔ سامنے درخت کے نیچے ایک عمدہ سی کار بھی کھڑی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ نوجوان قیوم صاحب کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ لیکن قیوم صاحب کا جو تصوّر میں نے اپنے ذہن میں قائم کیا تھا وہ بالکل غلط ثابت ہوا، جیسا کہ عام طور پر ہوتا

ہے۔ ان کے چہرے پر بہیمانہ تعیش کی وہ علامات نہ تھیں جو بعض متمول اور آزاد نوجوانوں کے چہروں پر پائی جاتی ہیں۔ نہ بڑی سی توند تھی نہ مینڈک کی طرح پھولے ہوئے گال۔ وہ دبلے پتلے اکہرے جسم کے آدمی تھے۔ وضع قطع کی لطافت اور چال ڈھال کا بانکپن نسائیت کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ تنگ مہری کے پاجامے پر باریک چکن کا کرتا پہن رکھا تھا۔ گریبان میں اور مونڈھوں پر بیل لگی ہوئی تھی۔ ریشمی بنیان اندر سے اپنے ہلکے سبز رنگ کی جھلک دکھا رہا تھا۔ عمر کسی طرح سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔

برآمدے میں کھڑے کھڑے میرا اُن سے تعارف کرایا گیا۔ ابھی یہ رسم ادا ہو ہی رہی تھی کہ شرما جی ٹانگے میں آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ اُن کے ہمراہ کوئی دوسرا شخص نہیں تھا۔

"کیا بات ہے!" ظہیر بھائی اندیشہ ناک لہجے میں بولے، "چیرمین صاحب ٹانگے میں نہیں ہیں!۔۔۔ بڑی کوفت ہوگی اگر وہ نہ آئے!"

میں نے دل میں کہا کہ اگر وہ نہ آئے تو بہت ہی اچھا ہوگا۔ میں صبح سے اب تک بہت کافی سیر کر چکا تھا، اور اب دریا کی سیر کا قطعی کوئی جذبہ میرے دل میں نہیں تھا۔

شرما جی اگرچہ ٹانگے میں بیٹھ کر آئے تھے، مگر بُری طرح ہانپ رہے تھے۔

"کہئے اجی۔ او صاحب!" ظہیر بھائی نے بیقراری کے ساتھ کہا، "چیرمین صاحب کہاں ہیں؟"

"اُفوہ بڑی گرمی ہے!" شرما جی نے ہانپتے ہوئے اور رومال سے چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا، "قیوم صاحب! آداب عرض! مزاج اچھا ہے؟ آپ آگئے! اور آم بھی لے آئے! بہت خوب!۔۔۔ یار ظہیر یہ چمن صاحب تو بعض اوقات بہت

ہی پریشان کرتے ہیں۔ میں نے بہت کہا مگر وہ کسی طرح نہیں مانے ـــــ"

"کیا وہ نہیں چلیں گے؟" ظہیر بھائی پر سخت سراسیمگی کا عالم طاری تھا۔

"چلیں گے تو سہی، مگر تحصیلدار صاحب کے ہاں گئے ہیں۔ اُدھر سے ہوتے ہوئے آئیں گے ـــــ اب دیکھئے کب تک آتے ہیں۔ ویسے انھوں نے کہا تو ہے کہ آدھ گھنٹے کے اندر آتا ہوں۔" پھر ذرا شگفتہ ہو کر بولے، "کھانا البتہ آگیا ہے ـــــ ارے چپراسی! دیکھو ٹھلر صاحب سے کہو، کھانا تانگے میں سے اُٹھوا کر اندر رکھوالیں۔"

چند منٹ تک تینوں اصحاب کھانے کی نوعیت اور آموں کی عمدگی کے متعلق مزے لے لے کر باتیں کرتے رہے۔

جب اس موضوع پر کچھ کہنے کے لئے باقی نہ رہا تو شرما جی نے قیوم صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بڑی شفقت کے ساتھ بولے، "اب تو آپ ٹھیک ہیں؟ جی تو نہیں گھبراتا؟"

"جی ہاں، اب تو حالت بہتر ہے" قیوم صاحب نے ذرا شرما کر جواب دیا۔ "مگر خالی وقت کسی طرح نہیں کٹتا۔ ارے ہاں! ـــــ" وہ تیزی سے کار تک گئے اور اپنے ہاتھ میں رنگین لفافوں کا ایک ڈھیر لئے ہوئے واپس آئے۔

"انسپکٹر صاحب!" انھوں نے ظہیر بھائی سے مخاطب ہو کر کہا، "ذرا ہمارے یہ خطوط ڈلوا دیجئے گا۔"

"اتنے بہت سے خط!" ظہیر بھائی نے لفافوں کو لیکر الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا "یہ تو آپ نے کل لکھے تھے۔ ابھی تک نہیں ڈلوائے؟"

"وہ تو کل ہی ڈلوا دیئے تھے۔ یہ آج اور لکھے ہیں۔"

"اوفوہ! آپ اس کثرت سے خط لکھتے ہیں۔ اور روزآنہ اتنے بہت سے لکھ کیسے لیتے ہیں؟ کتنے ایک ہوں گے یہ؟"

"کوئی بیس پچیس ہیں۔"

"شاباش ہے بھئی!" شرماجی بولے، "لکھتے کیا ہیں آپ ان خطوں میں؟"

"بس اپنی خیریت لکھ دیتا ہوں" قیوم صاحب نے شرماتے ہوئے کہا۔ "خالی وقت ہے۔ اسی طرح کٹ جاتا ہے۔"

"اور روزانہ لکھتے ہیں؟" شرماجی نے سوال کیا۔ وہ اس نوجوان کی طفلانہ حرکت پر سخت متعجب تھے۔

"تقریباً روزانہ!"

"ارے! پتہ تو سب کے اوپر ایک ہی ہے، ناموں کے فرق کے سوا" ظہیر بھائی نے چونک کر کہا۔ "یہ کیا بات؟"

"سب کو علیحٰدہ علیحٰدہ خط لکھتا ہوں" قیوم صاحب نے جواب دیا۔

"مگر یہ سب لوگ رہتے تو ایک ہی گھر میں ہیں؟"

"ہاں! مگر خط و کتابت تو علیحٰدہ علیحٰدہ کرتے ہیں۔"

جہاں تک مجھے معلوم تھا، شرماجی قیوم صاحب کو بہت دنوں سے جانتے تھے۔ مگر اس وقت وہ اُن کو اس طرح حیرت کے ساتھ اوپر سے نیچے تک دیکھ رہے تھے گویا اس عجیب و غریب نوجوان سے ابھی ابھی ملاقات ہوئی ہے۔

میں بھی یہ خیال کر کے مسکرا پڑا کہ اس شخص نے اپنے خالی اوقات کو پُر کرنے کا کیسا اچھا اور سستا طریقہ نکالا ہے۔

شرما جی نے مجھے مسکراتے ہوئے دیکھا تو میری طرف متوجہ ہو گئے۔ "کہئے آپ نے ہمارے قیوم صاحب سے ملاقات کی ؟"

"جی ہاں ، نیاز حاصل ہوا" میں نے کہا۔ "بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں !"

قیوم صاحب نے بھی میری تعریف میں کچھ کہنا ضروری سمجھا۔

"مجھے بھی آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا" وہ بولے۔ "انسپکٹر صاحب سے اکثر آپ کی تعریف سنی تھی۔ اور آپ کا کلام سننے کی بڑی آرزو تھی ـــــ اُمید ہے آج یہ آرزو پوری ہو سکے گی۔"

"ضرور ، ضرور !" میں نے کہا۔ "یہ تو آپ کی قدر افزائی ہے۔"

"اچھا کیا آپ کو شاعری سے بھی کچھ دلچسپی ہے ؟" شرما جی نے سوال کیا۔ شاعری سے اُن کا مطلب شعر گوئی تھا۔

میرے جی میں آئی کہ اُن سے کہوں ، "جناب ! کچھ ، نہیں ، بہت زیادہ دلچسپی ہے۔ بلکہ مجھے اُس کا جنون ہے۔ اور میں اس ذوق کی خاطر اپنی تمام زندگی کو برباد کر چکا ہوں۔ میری نظموں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ میری شاعری اپنی جدت اور قدرت کے لحاظ سے جدید اردو ادب میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ آپ ایک نامور شاعر سے اس قسم کا سوال کر کے اپنی افسوسناک عدمِ واقفیت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ آپ میری توہین کر رہے ہیں !"

لیکن اس کی بجائے مَیں نے خالص شاعرانہ انکسار سے کام لیتے ہوئے جواب دیا ، "جی ہاں ، کبھی کبھی کچھ کہہ لیتا ہوں ـــــ یونہی دل بہلانے کی خاطر !"

"تب تو واقعی آج آپ کا کلام سنا جائے گا ،" شرما جی نے ایک مربیانہ انداز میں

مجھے یقین دلایا۔ "آپ اپنے ساتھ کچھ بیٹر لائے ہیں؟"

"بیٹر!" میں نے سخت حیرت کے ساتھ کہا۔

"ہاں ہاں، کچھ بیٹر لائے ہیں؟"

"بیٹر بازی تو میں نے کبھی نہیں کی شر باجی!"

"بیٹر بازی!" ظہیر بھائی نے زور کا قہقہہ لگایا۔ "ارے میاں! اسی۔ او صاحب "میٹریل" کہہ رہے ہیں ـــــ وہ کہاں ہے تمہاری بیاض؟"

شر باجی کی گویائی اور میرے سامعہ کی یہ تیسری اہم سازش تھی۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس مرتبہ شر باجی کو بہت بُری طرح جھینپنا پڑا۔

"بڑی گرمی ہے صاحب،" وہ گھبرا کر بولے۔ "چلئے اندر چل کر بیٹھیں ـــــ چمن صاحب تو معلوم نہیں کب تک آئیں گے۔"

ہم لوگ پھر شر باجی کے دفتر میں پہنچ گئے۔

"انسپکٹر صاحب! اب کے کسی چھٹی میں دہلی چلئے،" قیوم صاحب نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ظہیر بھائی سے کہا۔ "ہمیں ایک موٹر سائیکل خریدنا ہے۔ ہمارے وہاں لکھنؤ میں تو اچھی گاڑی نہیں ملتی۔"

"چلئے ہم تو ہر وقت تیار ہیں،" ظہیر بھائی نے جواب دیا۔

میں نے اس سلسلے میں اُن دونوں کی ہمّت افزائی کرنا اپنا اخلاقی فرض خیال کیا۔ "جی ہاں، ضرور آئیے،" میں نے کہا، "مجھے بڑی خوشی ہوگی۔"

"مگر موٹر سائیکل تو آپ کے پاس ایک ہے؟" ظہیر بھائی بولے۔

"اجی وہ تو بہت ہلکی گاڑی ہے ـــــ وہ تو ہم نے یونہی پچھلی عید پر لے لی تھی۔ تھی

تفریحاً ــــ ہمیں عیدی ملی تھی۔ وہ روپے ہمارے پاس موجود تھے۔ شام کو ٹہلنے نکلے۔ گاڑی نظر آگئی، وہی خرید لی ــــ"

"چپراسی!" شہ باجی چلائے، "دیکھو یہ مینا کی بچی پھر غائب ہے۔ بلاؤ اس کو۔"

"اور دیکھو،" ظہیر بھائی بولے، "بشیرا سے یہاں چھڑکاؤ کرنے کو کہا تھا۔ اُس کم بخت نے سنی اَن سُنی کر دی ــــ"

"سرکار! بشیرا کی تو نکسیر پھوٹ گئی ہے۔ وہ اپنی کوٹھری میں پڑا ہے۔ خون کسی طرح رُکتا ہی نہیں ــــ"

"اچھا، اچھا، مینا کو بلاؤ،" شہ باجی نے بے قراری سے کہا۔

"نام خوب ہے اس کا ــــ مینا!" قیوم صاحب بولے۔

"اور باپ کا نام کوّا ہے،" ظہیر بھائی نے کہا۔

"کوّا!"

"جی ہاں، کوّا! ــــ بات یہ ہے کہ جب ان کے ہاں بچّہ پیدا ہوتا ہے تو جو چیز سب سے پہلے ان کی نظر کے سامنے آتی ہے اُسی کا نام بچے کو دے دیا جاتا ہے ــــ اب جو یہ مینا ہے نا۔ پچھلے سال اس کے ہاں لڑکا ہوا تھا اس دن تحصیلی اسکول کی ٹیم یہاں آئی ہوئی تھی۔ وہ لڑکے آپس میں باتیں کر رہے تھے اور "پلیئر" کا لفظ بار بار ان کی زبان پر آتا تھا۔ بس کوّا نے اُس بچے کا نام بھی پلیئر رکھ دیا۔"

"خوب!" قیوم صاحب بولے۔

"لڑکا مینا کے یہاں پیدا ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں اور کیا!" ظہیر بھائی نے جواب دیا۔ "کیوں، کچھ تعجب کی بات ہے؟"

"بہت کم عمر ہے وہ لڑکی" میں نے دبی زبان سے کہا۔

"نہیں میاں! کم عمر کیوں ہوتی۔ پوری عورت ہے۔"

"شوہر کہاں ہے اِس کا؟"

"شوہر!" ظہیر بھائی کی آنکھوں میں شرارت ناچنے لگی "وہ شوہر اُس کا اُس کے ساتھ رہتا ہے۔"

"اُس کے ساتھ؟"

"ہاں اُسی جھونپڑی میں۔"

"وہ تو ایک کالا سا ادھیڑ عمر کا آدمی ہے ــــ کوّا اُسی کا نام تو ہے شاید؟"

"ہاں اور وہی اُس کا شوہر ہے۔"

"وہ تو اُس کا باپ ہے ــــ ابھی آپ کہہ رہے تھے نا؟"

"اب کیا خبر باپ ہے کہ شوہر ہے" شرما جی نے اِس گفتگو سے بیزار ہو کر کہا۔
اور ظہیر بھائی نے ایک قہقہہ لگایا۔
اُسی وقت چپراسی کمرے میں داخل ہوا۔

"سرکار وہ تو کہیں چلی گئی ہے۔"

"کیا!" شرما جی نے اچھل کر کہا "کہاں چلی گئی حرام زادی؟ ــــ کوّا کو بلاؤ۔"

"وہ بھی نہیں ہے حضور!"

"وہ بھی نہیں ہے!" شرما جی نے سخت غصّے کے عالم میں کہا "اچھی بات ہے۔ میں کروں گا اِن دونوں کا علاج ــــ دیکھو ــــ چپراسی!"

"حضور!"

"وہ آئیں تو دونوں کو باہر نکال دو، اور جھونپڑا فوراً خالی کرالو ـــــ"

"ارے صاحب! پڑا رہنے دیجئے چوہے کھانی کو،" ظہیر بھائی نے سفارش کی۔ "ذرا اُسے کوّا کو بلا کر اچھی طرح ڈانٹ دیجئے گا...."

چند منٹ میں شرماجی کا غصہ فرو ہو گیا تو میں نے ظہیر بھائی سے پوچھا، "آپ اس کو چوہے کھانی کیوں کہتے ہیں؟" میری دلچسپی نمایاں طور پر بڑھتی جا رہی تھی۔

"اس لئے کہ وہ چوہے کھاتی ہے" ظہیر بھائی نے مستعدی سے ساتھ جواب دیا۔ "تم اسے مذاق نہ سمجھنا۔ یہ حقیقت ہے۔ ابھی پچھلے جاڑوں کی بات ہے۔ ہم لوگ ایک دن دوپہر کے وقت یہیں ای۔ او صاحب کے دفتر میں کام کر رہے تھے کہ یکایک بدبو کے مارے سب کا دماغ پریشان ہو گیا۔ بھاگے اٹھ کے یہاں سے۔ بڑی دیر تک تو معلوم ہی نہیں ہوا کہ یہ بدبو آئی کہاں سے۔ لیکن پھر بعد میں حقیقت کا پتہ چلا۔ یہ دونوں، مینا اور کوّا، اپنے جھونپڑے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اوپر چھپر میں سے ایک چوہیا گری۔ انھوں نے اسے پکڑ کر چولھے کے اندر بھوبھل میں ڈال دیا۔ اور وہیں نمک مرچ لگا کر کھا گئے...."

قیوم صاحب کو اُبکائی آئی اور وہ تھوکنے کے لئے دوڑے ہوئے باہر گئے۔

میں نے اپنے حلق میں ایک قسم کی خشکی محسوس کی۔

شرماجی بولے، "ارے صاحب! چوہا کھانے میں اسے کیا عار جو انسان کو ہضم کر جائے۔"

"یعنی؟ ـــــ کیا مطلب آپ کا؟" میں صرف حیران ہی نہیں، بلکہ پریشان بھی ہو رہا تھا۔

"اب کیا جانیں !" شرما جی نے جواب دیا، "ہمیں تو کچھ معلوم نہیں۔ یہی آپ کے ظہیر صاحب کہتے ہیں کہ یہ دونوں اُس بچے پلیٹر کو ذبح کر کے کھا گئے۔"

"میں تو نہیں کہتا،" ظہیر بھائی بولے، "چپراسی وغیرہ کہتے ہیں ۔۔۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ کرسمس کی تعطیل سے پہلے وہ بچہ موجود تھا اور اچھا خاصا تھا۔ گورا، چٹا۔ بالکل اپنی ماں کی شکل کا۔ ہم تعطیل کے بعد آئے تو معلوم ہوا کہ مر گیا۔ مگر چوکیدار کہتا ہے کہ وہ ہرگز نہیں مرا۔ مرتا تو مجھے ضرور پتہ لگتا۔ یہی دونوں کاٹ کر کھا گئے ۔۔۔"

میں نے تصوّر کی آنکھ سے ایک پھول سے بچے کو ذبح ہوتے ہوئے دیکھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں یہ بھول گیا کہ میں کہاں ہوں۔

ظہیر بھائی کی آواز کہیں دور سے آتی ہوئی معلوم ہوئی، "۔۔۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہتا ہے کہ میں نے ہڈیاں پڑی ہوئی دیکھیں ۔۔۔۔"

میں اٹھا اور کھنکارتا ہوا باہر کی طرف چلا، گویا تھوکنے جا رہا ہوں۔ دروازے میں سے گزرتے وقت میں نے زور سے ایک ٹھوکر چوکھٹ کے ماری اور پھر ایک دل دوز کراہ کے ساتھ لڑکھڑا کر گر پڑا۔

سب دوڑ پڑے اور مجھے اٹھانے لگے۔

"میرے ٹخنے میں چوٹ آئی ہے۔ ظہیر بھائی!" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "ایسا کئی دفعہ ہو چکا ہے۔ یہ جوڑ ہمیشہ سے کمزور ہے ۔۔۔ مجھے گھر پہنچوائیے۔ میں تو اب تین دن تک ہل بھی نہیں سکتا۔۔۔۔"

سب نے یقین دلانے کی کوشش کی کہ کچھ دیر کرسی پر بیٹھ کر آرام کرنے سے تکلیف جاتی رہے گی۔ مگر میں نے کسی کی نہیں سُنی۔

بالآخر مجھے قیوم صاحب کی موٹر میں ڈال کر گھر پہنچا دیا گیا۔ اور قبل اس کے ظہیر بھائی دریا کی سیر سے واپس آئیں، میں دہلی کے لئے روانہ ہو چکا تھا۔

جس دن میں دہلی پہنچا اُس دن ریگل میں شرلے ٹمپل کی ایک تصویر دکھائی جا رہی تھی!

ایک واقعہ

(۱۹۴۱ء)

"روکو! ___ ارے گاڑی روکو! ___ گاڑی رکواؤ! ___"

یکایک یہ آواز انٹر کلاس کے مسافروں کو سنائی دی اور وہ چونک سے پڑے۔ پسنجر ٹرین تھی اور انٹر کلاس میں گنتی کے چند آدمی تھے ___ پانچ مرد اور ایک عورت! مردوں میں سب سے نمایاں شخصیت جن صاحب کی تھی وہ اگرچہ دیکھنے میں ایک مہاجن معلوم ہوتے تھے مگر اصل میں ایک وکیل تھے۔ اُن کا قد چھوٹا تھا اور جسم بھاری۔ مٹاپے کی وجہ سے اُن کے ہاتھ پاؤں بہت ہی چھوٹے نظر آرہے تھے۔ وہ سیٹ پر آلتی پالتی مارے بیٹھے ہوئے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی لحیم شحیم آدمی کے دھڑ میں ایک چھوٹے سے تندرست و توانا بچے کے ہاتھ پاؤں جوڑ دئے گئے ہیں۔ اُن کی گردن بھی بہت چھوٹی تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ٹھوڑی بالکل سینے سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اُن کی ٹھوڑی سینے کے اُس حصّے کو مس کر رہی ہے جس حصے کو ایک

داڑھی والے شخص کی داڑھی مس کیا کرتی ہے۔ اُن کے وکیل ہونے کی ایک بدیہی علامت یہ تھی کہ وہ مسلسل بول رہے تھے، اور اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو ہلا ہلا کر اپنے ساتھیوں سے بے تکان باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ اُن کے دو ساتھیوں میں سے ایک جن کو وہ خان صاحب کہہ کر مخاطب کر رہے تھے، ان کے اپنے قصبے کے میونسپل کمشنر تھے۔ اُن کی سب سے بڑی خصوصیت آواز کی بلندی اور لہجے کی کرختگی تھی۔ وہ وکیل صاحب کی بات کا جواب دیتے تو یہ معلوم ہوتا کہ انجن کی سیٹی کا جواب دے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے لحاف کو اوڑھنے کی بجائے اپنے نیچے بچھا رکھا تھا اور مزے سے ایک پوری سیٹ پر دراز تھے۔ ہر تین چار منٹ کے بعد وہ اپنا ایک ہاتھ دونوں رانوں کے بیچ میں ڈال کر کھجانے لگ جاتے تھے۔ وکیل صاحب کے دوسرے ساتھی ایک آنریری مجسٹریٹ تھے جو اُن کے برابر بیٹھے ہوئے اپنے دونوں دوستوں کی باتوں پر ایک بزرگانہ تبسم کی بارش کر رہے تھے۔ بات کرتے وقت بھی اُن کا انداز بزرگانہ ہوتا تھا۔ وہ ایک باریک دھوتی پر باریک کرتا پہنے ہوئے تھے۔ البتہ ٹانگوں پر ایک اونی دوشالہ ڈال رکھا تھا۔ یہ تینوں احباب سرکاری قسم کی گفتگو کر رہے تھے۔ اُن کے پاس کلکٹروں، ڈپٹی کلکٹروں، تحصیلداروں، پولیس انسپکٹروں، بورڈ کے ممبروں، اور اسی نوع کے دوسرے لوگوں کے اقوال و افعال کے سوا کوئی دوسرا موضوع گفتگو کیلئے نہ تھا۔ فلاں کلکٹر بڑا بدمعاش ہے، فلاں ڈپٹی کلکٹر نہایت عیار اور باتونی ہے، فلاں سب انسپکٹر اگرچہ ہے تو سب انسپکٹر، مگر بڑے بڑے حکام کو خاطر میں نہیں لاتا۔۔۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری باتیں تھیں جن سے وہ ایک دوسرے کی تواضع کر رہے تھے۔

ان تین آدمیوں کے علاوہ ڈبے میں ایک میاں بیوی بھی تھے۔ میاں ایک اوپر کی سیٹ پر اپنا بستر بچھائے گہری نیند کے مزے لے رہے تھے۔ وہ اپنے ایک نستی بھائی

کی شادی میں شریک ہو کر واپس ہوئے تھے، اور کئی دن کی جسمانی تھکن کو ریل میں اتار رہے تھے۔ اُن کی بیوی اُس سیٹ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں جس پر وکیل صاحب اور آنریری مجسٹریٹ صاحب آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ متوسط طبقے کی ایک سیدھی سادھی عورت تھی ــــــ ایسی عورت جس کی ساری زندگی برتن مانجھنے، جھاڑو دینے اور بچے پیدا کرنے ہی میں گزر جاتی ہے۔ اُس کے چہرے پر مشاطگی یا اوپری ٹیپ ٹاپ کا کوئی قابلِ ذکر اثر نہ تھا، نہ لباس سے ظاہری سج دھج کا شوق ظاہر ہوتا تھا۔ وہ نوجوان ہوتے ہوئے بھی اُن نوجوان عورتوں سے بہت مختلف تھی جو نک سک سے درست اور نوک پلک سے آراستہ ہوتی ہیں، اور دیکھنے والے کو نظر جما کر دیکھنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ حد یہ ہے کہ اُس کے ہونٹ پان کی سرخی تک سے محروم تھے۔ اُس کو حسین کہنا بھی دشوار تھا، کیونکہ اُس کی صورت شکل بہت معمولی تھی اور کوئی خاص کشش اپنے اندر نہ رکھتی تھی۔ البتہ نقوش میں ایک لطیف نرمی اور انکھوں میں ایک پاکیزہ روشنی کی جھلک ناقابلِ انکار طور پر پائی جاتی تھی، اور اسی بنا پر اُس کو کم رُو یا بدصورت کہنا بھی کسی طرح ممکن نہ تھا۔ غرض یہ کہ وہ ظاہری اور فطری سادگی کا مجسمہ تھی۔ شاید یہ اسی سادگی کا نتیجہ تھا کہ وہ بغیر کسی جھجک کے اپنی جگہ پر بیٹھی ہوئی تھی اور نہایت بے تکلفی کے ساتھ وکیل صاحب، خان صاحب اور آنریری مجسٹریٹ صاحب کی باتیں سُن رہی تھی۔ وکیل صاحب بول رہے ہوتے تو اُن پر نظر جمائے رہتی، خان صاحب کچھ کہتے تو اُن کی طرف دیکھنے لگتی، اور آنریری مجسٹریٹ صاحب اپنی بزرگانہ بلندی سے کوئی بات کہتے تو اُس کی توجہ اُن کی طرف ہو جاتی۔ ہر تین چار منٹ کے بعد خان صاحب اپنا ایک ہاتھ دونوں رانوں کے بیچ میں ڈال کر کھجانے لگتے تو اُس کی نظر خان صاحب کے ہاتھ کی جنبشوں پر جم جاتی، اور اس وقت تک جمی رہتی جب تک کہ خان صاحب

کے ہاتھ کی یہ مصروفیت ختم نہ ہو لیتی۔

ڈبے کا چھٹا مسافر جو تیسری سیٹ پر اپنا قبضہ جمائے ہوئے تھا ایک لکھنوی ٹھاٹھ کا نوجوان شاعر تھا۔ لکھنوی ٹھاٹھ کا محض اس لئے کہا گیا کہ جس طرح اُس کی شاعری لکھنو ہی انداز کی تھی اسی طرح اُس کی ریشمیں رزائی سے لکھنوی نفاست کا ثبوت ملتا تھا۔ ورنہ یوں وہ ایک داڑھی مونچھ صفاچٹ قسم کا نوجوان تھا اور ہر حیثیت سے مغربی طور طریقوں کا دلدادہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ وکیل صاحب، خانصاحب اور آنریری مجسٹریٹ صاحب کی ختم نہ ہونے والی گفتگو کو حقارت اور بے توجہی کے ساتھ سن رہا تھا۔ اُس کو افسوس تھا کہ یہ لوگ شعر و شاعری سے کوئی مس نہیں رکھتے، اور گھٹیا قسم کی غیر شاعرانہ باتوں میں اپنا دماغ کھپاتے ہیں۔ وہ اُن کی ساری گفتگو کو کھوکھلا اور بے مغز سمجھتے ہوئے دل ہی دل میں اُن کو قابلِ نفرت ٹھہرا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ اُن کی بھدی اور غلط اردو پر جی ہی میں کڑھنے لگتا، اور اُس کے ساتھ ساتھ اپنی زبان دانی پر ایک فخر سا محسوس کرتا۔ وکیل صاحب "سہولدیت"، "تابعدار"، "لاپرواہی"، "انکساری"، اور "ماہواری"، جیسے غلط اور مہمل الفاظ استعمال کر رہے تھے، اور خان صاحب مستقل طور پر "آوے ہے"، اور "جاوے ہے"، قسم کی غیر فصیح اور دیہاتی زبان بول رہے تھے۔ اس ناقص زبان سے شاعر کی مہذب سماعت مجروح ہو رہی تھی اور وہ نفرت کے مارے منہ پھیر پھیر لیتا تھا۔ ڈبے میں اگر کوئی چیز اُس کے لئے دلچسپی کا باعث ہو سکتی تھی تو وہ نوجوان عورت تھی۔ اس غیر شاعرانہ اور مادیت زدہ ماحول میں یہی ایک چیز ایسی تھی جو اپنے اندر کچھ شعریت، کچھ لطافت، کچھ رومانیت اور کچھ غزلیت رکھتی تھی۔ ہر چند کہ وہ حسین نہ تھی، مگر کسی حسین عورت کی عدم موجودگی میں شاعر اُسی کا سہارا لینے پر مجبور تھا۔ وہ اُس کو غور سے دیکھ رہا تھا تاکہ اُس

کے متعلق کوئی شدید جذبہ محسوس کر سکے، اور یوں دو چار شعر موزوں کرکے میں کامیاب ہو جائے
(چند مصرعے تو اُس کے ذہن میں آ بھی چکے تھے!) وہ اس کی ہر ادا کا جائزہ لے رہا تھا!
کبھی وکیل صاحب کوئی تعجب خیز یا خندہ انگیز بات کہتے تو اس کا، یعنی نوجوان عورت کا،
منہ تھوڑی دیر کے لئے کھُلتا اور کھلے کا کھلا رہ جاتا۔ اُس وقت شاعر اپنے دل میں کہتا،
"کیسا خوبصورت ہے اس کا منہ! اور کتنے رسیلے ہیں اِس کے ہونٹ! مگر افسوس کہ یہ پان
نہیں کھاتی! اگر یہ پان کھائے ہوئے ہوتی تو اُس کے سُرخ ہونٹ کتنے اچھے معلوم ہوتے!
یہ جو اُس کے چہرے پر ایک پھیکا پن اور اس کے سادہ حسن میں ایک بے رونقی سی پائی جاتی
ہے اِس کا سبب صرف یہ ہے کہ یہ پان نہیں کھاتی۔ کاش یہ پان کھایا کرتی! کاش...
......" پھر خان صاحب اپنا ہاتھ دونوں رانوں کے بیچ میں ڈال کر کھجانے لگ جاتے اور نوجوان
عورت اُن کے ہاتھ کی جنبشوں کا مطالعہ کرنے لگتی۔ اس وقت شاعر اپنی نظریں نوجوان
عورت کی نظروں پر جما دیتا اور یہ دیکھنے کی کوشش کرتا کہ یہ حد سے زیادہ بے تکلف عورت
کب اپنی نظریں خان صاحب کے ہاتھ پر سے ہٹاتی ہے۔ مگر اُس کی نظریں وہیں جمی رہتیں اور
شاعر اپنے دل میں سوچنے لگتا: "اس دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی سمجھ دار اور حساس عورت
ہو جو ایک لمحے سے زیادہ اِس نظارے کی تاب لا سکے۔ پھر یہ نوجوان عورت کیوں اِس
نظارے سے حریصانہ طور پر لطف اندوز ہونے کی کوشش کر رہی ہے؟ کیا وہ سمجھ دار
اور حساس نہیں ہے؟..............................

.... اور یہ مرد؟ یہ بے تمیز اور جاہل انسان؟ کیا یہ گدھے سے بدتر نہیں
ہے؟........" اتنے میں خانصاحب کے ہاتھ کی مصروفیت ختم ہو جاتی، اور نوجوان
عورت کی نظریں وہاں سے ہٹ کر وکیل صاحب کے چہرے پر جم جاتیں۔ وکیل صاحب

کوئی تعجب خیز یا خندہ انگیز بات کہتے۔ عورت کا منہ ذرا دیر کے لئے کھُلتا اور کھُلے کا کھلا رہ جاتا۔ شاعر اپنے دل میں کہتا: "افسوس کہ یہ پان نہیں کھاتی! اگر یہ پان کھائے ہوئے ہوتی تو اس کے سُرخ ہونٹ کتنے اچھے معلوم ہوتے! ......"

یہ تھے انٹر کلاس کے ڈبے کے چھ مسافر! پسنجر ٹرین تھی جو ہر اسٹیشن پر ٹھہرتی ہوئی آہستہ آہستہ چلی جارہی تھی۔ سردیوں کا زمانہ تھا اور شام کا وقت۔ اس لئے بیشتر کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے، اور چھ مسافروں میں سے کسی ایک کو بھی اتنا ہوش نہیں تھا کہ گاڑی کب اسٹیشن پر ٹھہرتی ہے اور کب روانہ ہوجاتی ہے۔

ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری اور دو منٹ بعد روانہ ہوئی۔ انٹر کلاس کے مسافر اس سے بے خبر رہے، مگر جب گاڑی پلیٹ فارم کو بہت پیچھے چھوڑ آئی تو یکایک یہ آواز سُن کر وہ چونک سے پڑے: "روکو!—— ارے گاڑی کو روکو!—— گاڑی رکواؤ!——"

نوجوان عورت کے شوہر اور لکھنوی شاعر کے علاوہ (کہ ایک گہری نیند کے نشے میں چُور تھا اور دوسرا شعر، محبت اور جوانی کی سرمستیوں میں غرق!) چاروں مسافر—— وکیل صاحب، خان صاحب، آنریری مجسٹریٹ صاحب اور نوجوان عورت—— اپنی اپنی جگہ سے اٹھے اور جدھر سے آواز آئی تھی اُدھر کی کھڑکیاں کھول کر باہر جھانکنے لگے۔ انھوں نے دیکھا کہ انٹر کلاس کے ڈبے کے برابر جو ڈبہ ہے اُس کے ہینڈل کو ایک شخص دونوں ہاتھوں سے پکڑے ہوئے لٹک رہا ہے اور ان کی طرف دیکھ دیکھ کر متواتر چیخ رہا ہے:

"گاڑی روکو!—— گاڑی رکواؤ!—— میں مر جاؤں گا!——"

یہ ایک دیہاتی تھا جو پچھلے اسٹیشن سے چلتی گاڑی پر سوار ہوا تھا۔ وہ اپنے

گاؤں کو چھوڑنے پر مجبور تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ٹکٹ نہ خریدنے پر بھی مجبور تھا ظاہر ہے کہ پلیٹ فارم پر پہنچکر گاڑی میں اُس وقت بیٹھنا جب کہ وہ کھڑی ہوئی تھی اُس کے لئے ناممکن بات تھی۔ چنانچہ جب گاڑی روانہ ہوگئی اور پلیٹ فارم سے بھی کچھ آگے نکل گئی تو وہ اُچھل کر گاڑی پر چڑھ گیا اور ہتھے کو پکڑ کر کھڑا ہوگیا۔ دروازہ کھول کر اندر جانا چاہا تو دروازے نے کھلنے سے انکار کر دیا۔ یہ اصل میں ایک فسٹ کلاس کا ڈبہ تھا اور مسافروں سے خالی ہونے کی بنا پر مقفّل تھا۔ جب وہ اپنی پوری قوت صرف کرکے بھی اس کو نہیں کھول سکا تو اُس نے سوچا کہ کھڑکی کے راستے سے اندر چلا جاؤں۔ مگر کھڑکی کا بھی شیشہ چڑھا ہوا تھا، اور یہ راہ بھی مسدود تھی۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ نیچے کود پڑے۔ مگر گاڑی کی رفتار تیز ہوچکی تھی، اور زمین بجلی کی سی سرعت کے ساتھ مخالف سمت میں جاتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ اُس نے نیچے کود پڑنے کی ہمت اپنے اندر نہ پائی۔ زور زور سے چیخنا شروع کر دیا: "گاڑی روکو! —— ارے گاڑی رکواؤ! ——"

انٹر کلاس کے مسافروں نے اپنے سر کھڑکیوں سے باہر نکالے تو انھوں نے اُس کو ہتھے سے لٹکتا ہوا پایا۔

وکیل صاحب چیخ کر بولے، "ابے اندر چلا جا —— دروازہ کھول کے اندر چلا جا۔"

خان صاحب نے بھی بے اختیار یہی مشورہ دیا: "اندر چلا جا۔"

"دروازہ بند ہے"، دیہاتی چلایا۔

انٹر کلاس کے مسافروں نے صورتِ حال کا اندازہ لگایا اور کافی غور و خوض کے بعد دوسرا قیمتی مشورہ عنایت کیا: "ابے نیچے کود پڑ! ——"

زمین بجلی کی سی سرعت کے ساتھ مخالف سمت میں اڑی چلی جا رہی تھی۔ دیہاتی اس

خودکشی پر تیار نہ ہوا، اور بدستور چیخے گیا، "گاڑی رکواؤ! ــــ میں مرجاؤں گا! ــــ"

انٹر کلاس کے مسافروں کے ذہن میں اُس زنجیر کی یاد تازہ ہو گئی جسے کھینچ کر گاڑی کو رکوایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے کنکھیوں سے زنجیر کی طرف دیکھا۔ پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک دوسرے کی آنکھوں میں اُنھیں زنجیر لہراتی ہوئی نظر آئی۔ وکیل صاحب، خان صاحب، آنریری مجسٹریٹ صاحب ــــ تینوں کے دماغ میں ایک ہی خیال گونج رہا تھا: "زنجیر کھینچنی چاہئیے"، اور تینوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں اسی ایک خیال کو پڑھ رہے تھے۔ اس ناخوشگوار خیال سے جان بچانے کے لئے اُنھوں نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔

"حرامزادہ نیچے نہیں کود پڑتا، فضول چلّائے جارہا ہے"، وکیل صاحب نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو نچاتے ہوئے کہا۔

خان صاحب نے اپنا سر کھڑکی سے باہر نکالا، اور اپنی آواز کی پوری بلندی اور لہجے کی تمامتر کرختگی کے ساتھ کہا "ابے نیچے کود پڑتا ــــ نیچے کیوں نہیں کود پڑتا۔"

آنریری مجسٹریٹ صاحب اپنے بزرگانہ انداز میں بولے، "کم بخت جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں ــــ اس سے پوچھئے کہ چلتی گاڑی پر سوار ہونے کی کیا ضرورت تھی ــــ"

تینوں بے معنی طور پر چیخ رہے تھے۔

تینوں کے دماغ میں ایک ہی خیال گونج رہا تھا: "زنجیر کھینچنی چاہئیے ــــ زنجیر کھینچنی چاہئیے ــــ زنجیر کھینچنی چاہئیے ــــ"

تینوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں اسی ایک خیال کو پڑھ رہے تھے۔

اور تینوں اپنی بے معنی چیخ پکار کے ساتھ دل ہی دل میں یہ کہہ رہے تھے:

"زنجیر کون کھینچے! اتنا بڑا اقدام کون کرے! بیٹھے بٹھائے مفت کی مصیبت کون مول لے!"

گاڑی کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی!

زمین زیادہ سے زیادہ سرعت کے ساتھ مخالف سمت میں دوڑ رہی تھی!

دیہاتی برابر چیخ رہا تھا! "گاڑی رکواؤ! — میں مرا! — گاڑی رکواؤ!"

نوجوان عورت کبھی وکیل صاحب کو دیکھتی تھی، کبھی خان صاحب کو، اور کبھی آنریری مجسٹریٹ صاحب کو۔ جب اُس نے دیکھا کہ اِن لوگوں کی چیخ پکار کسی نتیجے پر نہیں پہنچتی اور گاڑی کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے تو اُس نے کمال سادگی اور انتہائی بے ساختگی کے ساتھ اپنا ہاتھ اوپر اُٹھایا اور زنجیر کھینچ لی۔

وکیل صاحب، خان صاحب، اور آنریری مجسٹریٹ صاحب کی چیخ پکار بند ہو گئی۔ تینوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ اور ایک مطمئن ضمیر کے ساتھ کھڑکیوں سے جھانک کر باہر دیکھا۔

دیہاتی کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ نہ وہ ہتھے سے لٹک رہا تھا، نہ کہیں زمین پر پڑا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

"گر پڑا"، تینوں ایک ساتھ بولے، "زنجیر بھی ناحق کھینچی!"

"ہے ہے! گر پڑا!" نوجوان عورت نے بے ساختہ کہا، اور اُس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

شاعر اپنی لکھنوی ٹھاٹھ کی ریشمی رضائی میں لپٹا ہوا، اور شعر محبت اور جوانی کی لذتوں میں کھویا ہوا، بدستور اپنی سیٹ پر دراز تھا۔ اُس نے نوجوان عورت کا کھلا ہوا منہ دیکھا اور اپنے دل میں کہا، "افسوس کہ یہ پان نہیں کھاتی! اگر یہ

پان کھائے ہوئے ہوتی تو اس کے سرخ ہونٹ کتنے اچھے معلوم ہوتے۔۔۔!"

اٹھارہ آنے

(۱۹۴۶ء)

سورج ڈوبنے سے ذرا پہلے سیٹھ جی کے مکان کا دروازہ بڑے زور کے ساتھ کھٹکھٹایا گیا۔ گھر میں جتنے آدمی تھے ـــــ سیٹھ جی، ان کی بیوی، لڑکے لڑکیاں، نوکر چاکر، اور تین چار رشتے دار جو صبح سے اُن کے یہاں پناہ گزیں تھے ـــــ سب کے کلیجے کانپنے لگے اور چہرے زرد پڑ گئے "مسلمان غنڈے آن پہنچے!" ـــــ یہ خیال یک بیک ہر شخص کے دل پر چھا گیا۔

گذشتہ شام کو قصبے کے بنیوں اور قرب و جوار کے مسلمان دیہاتیوں کے درمیان غلے کی خرید و فروخت پر کچھ جھگڑا ہو گیا تھا۔ صبح تک اس معمولی جھڑپ نے ہندو مسلم فساد کی شکل اختیار کر لی۔ قصبے میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی، مگر صاحبِ زر طبقہ حسبِ معمول ہندوؤں پر مشتمل تھا۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ دولت مند مہاجنوں اور مال دار بنیوں کے لئے یہ وقت بہت ہی نازک تھا۔ اُن کو اپنی جان کی حفاظت کے علاوہ دھن

دولت کی رکھوالی بھی کرنی تھی۔ سیٹھ جی قصبے کے سب سے بڑے رئیس تھے اور درمیانی طبقے کے فاقہ کش مسلمانوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے تھے۔ اس لئے اور بھی کہ انھوں نے اپنی ساری دولت اسی قصبے کے باشندوں کو لوٹ کھسوٹ کر جمع کی تھی۔ بیس سال پیشتر جب وہ اس قصبے میں ایک پھٹا ہوا کُرتا اور ایک میلی کچیلی دھوتی پہنے ہوئے تن تنہا وارد ہوئے تھے تو اس وقت اُن کی کُل پونجی ایک خوانچہ تھا جس میں اٹھارہ آنے کا مال تھا۔ بہت دنوں تک وہ اسی طرح گلیوں اور کوچوں میں گھوم پھر کر اپنا مال بیچتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایک دوسرا کاروبار بھی شروع کر دیا۔ یعنی کسی کو چار آنے اُدھار دے دیئے، کسی کو آٹھ آنے، کسی کو ایک روپیہ کسی کو ڈیڑھ روپیہ۔ کچھ دنوں بعد وہ ایک مکان پر بیٹھ کر اپنا مال بیچنے لگے۔ پھر یہ دوکان ایک سرائے میں تبدیل ہو گئی۔ سیٹھ جی نے زمینوں اور جائدادوں کو نیلام کرا کرا کے اپنی ملکیت بنانا شروع کیا، یہاں تک کہ قصبے کی اندرونی دولت کا ایک بہت بڑا حصّہ اُن کے تصرف میں آگیا۔ بیس سال کی مسلسل محنت اور سعیِ جانفشانی کے بعد اب وہ قصبے کے سب سے بڑے رئیس تھے۔ چنانچہ علی الصباح جب انھیں بلوے کی خبر ملی تو انھوں نے اپنے پختہ مکان کا بڑا دروازہ اندر سے مقفل کرا لیا، اور متعلقین و ملازمین سمیت اس قلعے میں محصور ہو کر بیٹھ گئے۔ دن بھر یہ لوگ خوف و ہراس میں مبتلا رہے، اور سہمی ہوئی دعاؤں کے ساتھ بھگوان کو یاد کرتے رہے۔ مگر جس بات کا اندیشہ تھا وہ ہو کر رہی۔ یعنی شام ہونے سے ذرا پہلے مکان کا دروازہ بڑے زور کے ساتھ کھٹکھٹایا گیا۔ دستک کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ دروازے پر دو ایک آدمی نہیں، بلکہ پورا مجمع ہے۔ سب کے چہرے زرد ہو گئے اور کلیجے کانپنے لگے۔ ہر شخص نے اپنے دل میں یہی سوچا کہ مسلمان غنڈے آن پہنچے۔

تین نوکروں نے سارا دن چھت پر گزارا تھا۔ وہ اب بھی تھپڑوں اور اینٹوں کے ایک بہت بڑے انبار کے درمیان وہیں موجود تھے۔ انھوں نے منڈیر پر سے جھانک کر نیچے دیکھا۔ وہاں نہ مسلمان غنڈے تھے نہ ہندو ننگے، بلکہ پولیس کے تقریباً نصف درجن آدمی خاکی وردیاں اور لال پگڑیاں پہنے ہوئے دروازے کو شدت کے ساتھ پیٹنے میں مصروف تھے۔

سیٹھ جی کو معلوم ہوا کہ دروازے پر پولیس کے آدمی ہیں تو ان کی جان میں جان آئی بالائی منزل کے ایک کمرے سے سیٹھ جی کے بھتیجے نے اپنا گھٹا ہوا سر باہر نکالا اور دستک دینے والوں سے چند سوالات کئے۔ جواباً انھیں بتایا گیا کہ شہر سے کلکٹر صاحب نے پولیس کے حکام کو بھیجا ہے اور وہ سیٹھ جی سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔

اس معمولی تحقیق کے بعد دروازہ کھول دیا گیا۔ اور سیٹھ جی پولیس کے حکام کو نہایت عزت کے ساتھ اندر لے گئے۔ حکام کی اس جماعت میں ایک انسپکٹر، ایک سب انسپکٹر، ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل تھے۔ انسپکٹر اور سب انسپکٹر دونوں اپنے اپنے جوتوں سمیت صاف ستھری چاندنی پر چڑھ گئے اور گاؤ تکئے کی ٹیک لگا کر قالین پر بیٹھ گئے۔ ہیڈ کانسٹیبل بھی جوتا پہنے پہنے چاندنی پر جا بیٹھا۔ کانسٹیبلوں نے البتہ ذرا تمیز اور انسانیت سے کام لیا۔ جوتا تو انھوں نے بھی نہیں اتارا، لیکن اتنا ضرور کیا کہ چاندنی پر بیٹھنے کی بجائے دروازے کے پاس ہی اکڑوں بیٹھ گئے، یعنی اس جگہ جہاں انسپکٹر، سب انسپکٹر اور ہیڈ کانسٹیبل کو اپنے اپنے جوتے اتار دینے چاہئیے تھے۔

"فرمائیے، کیا حکم ہے؟" سیٹھ جی نے تعظیماً ہاتھ جوڑ کر عرض کیا۔

سیٹھ جی نے سب انسپکٹر صاحب کو اپنا مخاطب بنایا تھا۔ سب انسپکٹر صاحب نے انسپکٹر صاحب کی جانب دیکھا، اور انھوں نے کہنا شروع کیا "بات یہ ہے

رائے صاحب! کہ بلوے کی اطلاع کلکٹر صاحب کو صبح سویرے ہی پہنچ گئی تھی اور ہم لوگ راتج یہ سے فوراً بلائے گئے تھے۔ مگر کپتان صاحب نے حکم جاری نہیں کیا تھا۔ اس لئے ہمیں دیر ہوگئی......یوں سمجھئے کہ.........اے.......دیوان جی! کپتان صاحب کا حکم کس وقت ملا ہے ہمیں؟"

"یہی کوئی چار ساڑھے چار بجے ملا ہے حضور!" ہیڈ کانسٹبل نے پھرتی سے جواب دیا۔

"وہ حکم تو ہوگا تمہارے پاس؟" سب انسپکٹر صاحب نے ضمناً کہا "لائے ہو اپنے ساتھ؟"

"جی ہاں حضور لایا ہوں ـــ بستے میں ہے ـــ باہر موٹر پہ ـــ حضور کہیں تو لادوں"

یہ کہتے ہوئے دیوان جی اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگے، مگر سب انسپکٹر صاحب فوراً انسپکٹر صاحب کی طرف متوجہ ہوگئے۔ اس لئے اُن کی کوشش جہاں تھی وہیں ختم ہوگئی۔

انسپکٹر صاحب نے اپنے کلام کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا، "بس رائے صاحب! تو یہ سمجھئے کہ حکم ملتے ہی ہم فوراً روانہ ہوگئے۔ اگر حکم جلدی مل جاتا تو آپ کو دن بھر یہ پریشانی اٹھانی نہ پڑتی۔......"

"بڑی کرپا ـــ بڑی کرپا!" سیٹھ جی نے گھبراتے ہوئے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا، "تو ـــ تو ـــ ہونہہ ـــ ہونہہ ـــ"

انسپکٹر صاحب نے سیٹھ جی کی گھبراہٹ اور الجھن کو تاڑ لیا اور بولے "ڈپٹی کلکٹر صاحب کی مہربانی سے یہ انتظام ہوگیا ہے کہ قصبے کے سارے رئیس اپنا اپنا مال شہر

پہنچا دیں اور خزانے میں جمع کرا دیں۔ ہم لوگ اسی غرض سے آئے ہیں۔ کوتوال صاحب نے کہا تھا کہ سب سے پہلے رائے صاحب کے ہاں جائیے گا۔"

سب انسپکٹر صاحب ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبلوں سے مخاطب ہوئے، "معلوم ہوتا ہے اس قصبے میں مسلمان غنڈوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔"

"کچھ نہ پوچھئے حضور!" دیوان جی نے کہا، "ایک سے ایک چھٹا بدمعاش یہاں موجود ہے۔ بہت سے تو ایسے ہیں جو لمبی لمبی سزائیں کاٹ چکے ہیں......"

"یہ مسلمان تو سبھی غنڈے ہوتے ہیں سرکار!" ایک کانسٹیبل بولا، "بھلا مانس تو ان میں ایک آدھ ہی ہوتا ہے۔ ہر وقت لڑنے مرنے پر تیار رہتے ہیں......"

سیٹھ جی کے سوا تقریباً ہر شخص نے "مسلمان غنڈوں" کے غنڈے پن پر اظہار خیال کیا۔ سیٹھ جی کچھ فکر مند معلوم ہوتے تھے۔

مسلمان غنڈوں کو جی بھر کر گالیاں دے لینے کے بعد انسپکٹر صاحب اُن کی طرف متوجہ ہوئے۔ "تو رائے صاحب! ذرا جلدی کیجئے۔ ہمیں لالہ مول چند سے بھی ملنا ہے......"

"میں یہ کہتا تھا،" سیٹھ جی بولے، "کہ آپ...... میرا مطلب ہے ٹھاکر رسال سنگھ نہیں آئے......" ٹھاکر رسال سنگھ قصبے کے تھانے دار کا نام تھا۔

"اجی رائے صاحب!" انسپکٹر صاحب نے قدرے بیزار اور بیقرار ہو کر کہا، "ٹھاکر رسال سنگھ کو اتنی فرصت کہاں ہے! وہ اپنے انتظامات میں مصروف ہیں۔ کل سے بیسیوں قتل ہو چکے ہیں......"

سب انسپکٹر صاحب پھر ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبلوں سے مخاطب ہوئے، "کیسے بُرے وقت ہوا ہے یہ بلوہ! اِدھر تحصیلدار صاحب بیمار ہیں، اُدھر ایس۔ ڈی۔ او۔ چھٹی پر ہے...."

دیوان جی نے ہاں میں ہاں ملائی اور تھوڑی دیر تک بلوے کی ہولناکیوں اور انتظامات کی غیر تسلی بخش حالت پر گفتگو ہوتی رہی۔ سیٹھ جی نے اس گفتگو میں کوئی حصہ نہیں لیا، گوان کا بھتیجا اپنے گھٹے ہوئے سر پر ہاتھ پھیر پھیر کر خوب باتیں ملاتا رہا۔

پھر یکا یک سیٹھ جی بولے، "ایک بڑی مشکل ہے انسپکٹر صاحب! میں اب اس وقت گھر چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہوں؟ بلوے کا زمانہ ہے ایسی حالت میں......"

انسپکٹر صاحب نے جلدی سے کہا "تو آپ کو ایسا کون سا بہت دور جانا ہے۔ آدھ گھنٹے میں شہر پہنچ جایئے گا۔ وہاں آپ کو چند منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے......"

سب انسپکٹر صاحب بہت بے پروائی سے بولے "ہم لوگوں کو واپس تو آنا ہی ہے۔ آپ کو کار میں بٹھاتے لائیں گے۔ ہمیں تو کئی پھیرے کرنے ہیں۔ لالہ مول چند سے ملنا ہے، پنڈت سنیتا رام سے ملنا ہے......"

"رات بھر کا چکر ہے حضور!" دیوان جی بولے۔

"رات بھر کا نہیں تو گیارہ بارہ بجے تک کا تو کام ہے ہی،" سب انسپکٹر صاحب نے کہا۔

سیٹھ جی مطمئن ہو گئے، اور چند رسمی اور غیر ضروری باتوں کے بعد "بڑی کرپا! بڑی کرپا!" کرتے ہوئے اندر گئے۔

تھوڑی دیر میں انھوں نے اپنی بیس سال کی کمائی باہر نکال کر رکھ دی — جواہرات سونے کے زیورات، چاندی کے ظروف، نوٹوں کی گڈیاں......

چیزوں کی فہرست بنانے لگے تو انسپکٹر صاحب نے کہا "یہ کام تو آپ وہیں کیجیے گا۔ کلکٹر صاحب کے سامنے۔ اب یہاں زیادہ دیر کرنی مناسب نہیں۔"

سیٹھ جی مع اپنی بیس سال کی کمائی کے موٹر میں بیٹھ گئے اور موٹر روانہ ہو گئی۔

"ذرا جلدی چلو بھئی!" انسپکٹر صاحب نے ڈرائیور سے کہا، "ابھی رائے صاحب کو واپس بھی لانا ہے۔"

"ہاں صاحب،" سب انسپکٹر صاحب بولے، "سیٹھ جی کو جلد سے جلد واپس گھر پہنچا دینا چاہیئے۔ بلوے کا زمانہ ہے۔ بال بچے پریشان ہوں گے۔"

"اجی توبہ کیجئے،" انسپکٹر صاحب نے کہا، "بھلا کسی کی مجال ہے جو رائے صاحب کے بال بچوں کو آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ لے۔ آخر ہم کس لئے ہیں؟"

"آپ کی دیا ہے انسپکٹر صاحب،" سیٹھ جی نے ممنون ہو کر کہا، "میں تو آپ کی رعایا ہوں۔"

"اجی رائے صاحب!" انسپکٹر صاحب اچھل کر بولے، "بھلا آپ کیسی باتیں کرتے ہیں ہم تو آپ کے خادم ہیں۔ آپ کی خدمت بجالانا ہمارا فرض ہے۔ اور پولیس کا سب سے پہلا کام تو آپ کے جان و مال کی حفاظت ہے۔ آپ اس قصبے کے سب سے بڑے رئیس ہیں...."

"یہ سب بھگوان کی دیا ہے اور آپ کی دعاؤں کا اثر ہے" سیٹھ جی نے کہا، "ورنہ آپ جانتے ہیں کہ میں تو ایک غریب دیہاتی کا بیٹا ہوں۔ آج سے بیس سال پہلے میں اس قصبے میں اٹھارہ آنے لے کر آیا تھا۔ آج بھگوان کی دیا سے......"

"اٹھارہ آنے!" پولیس کے حکام نے بیک وقت حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"جی ہاں، میں اٹھارہ آنے کا سودا لے کر اس قصبے میں آیا تھا۔ یہ سارا دھن اُسی کی پیداوار ہے۔"

پولیس کے حکام نے تحسین و آفریں کے نعرے بلند کئے:۔

"خوب! بہت خوب!"

"کیا کہنا ہے سیٹھ جی! واہ! واہ!"

"اجی آپ اس کو اٹھارہ آنے کی پیداوار کیوں کہتے ہیں؟ اپنی محنت اور مشقت کی پیداوار کہئے!"

"بے شک! بے شک! یہ سیٹھ جی کی محنت اور ایمانداری کا پھل ہے!"

سیٹھ جی پھول کر کپّا ہو گئے۔ مزے میں آکر کہنے لگے "آگے چل کر یہ سڑک جہاں مڑتی ہے بس وہیں میرا گاؤں ہے۔ آج سے بیس سال پہلے اٹھارہ آنے کا سودا ایک خوانچے میں رکھ کر میں اپنے گاؤں سے چلا تھا اور اسی سڑک پر ہوتا ہوا قصبے میں داخل ہوا تھا......"

وہ اپنے مہاجنی سفر کی ابتدا کا قصّہ بیان کر رہے تھے کہ اتنے میں کار سڑک کے اُس موڑ پر پہنچ گئی جہاں اُن کا گاؤں واقع تھا۔

"ٹھہرو!" انسپکٹر صاحب نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

کار رُک گئی!

انسپکٹر صاحب نے کار سے اتر کر چاروں طرف ایک سرسری نظر ڈالی اور کہا، "رائے صاحب! کس طرف ہے آپ کا گاؤں؟"

سیٹھ جی کار سے اُترے اور ہاتھ کے اشارے سے اپنا گاؤں بتانے لگے۔ "وہ ـــــ وہ دیکھئے ـــــ وہ جو درختوں کا ایک جھنڈ نظر آرہا ہے......"

لیکن انسپکٹر صاحب نے درختوں کے جھُنڈ کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نکالتے ہوئے بولے، "تو رائے صاحب! آپ اٹھارہ آنے اس جگہ سے لے کر روانہ ہوئے تھے؟"

"جی ہاں، میں اٹھارہ آنے کا سودا لے کر اسی راستے سے قصبے میں۔۔۔۔۔"

"تو یہ لیجئے اٹھارہ آنے حاضر ہیں!"

سیٹھ جی انسپکٹر صاحب کا منہ دیکھنے لگے۔

"لیجئے بھی۔ تکلّف کیا ہے؟"

سیٹھ جی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"لیجئے رائے صاحب!" انسپکٹر صاحب نے اصرار کے ساتھ کہا۔ "اپنے اٹھارہ آنے واپس لیجئے۔ آپ تو اس رقم کو بہت بڑی دولت میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ ایک دفعہ آپ نے ایسا کیا، اب ہماری خاطر سے ایک دفعہ اور سہی۔" اور انھوں نے زبردستی سیٹھ جی کے ہاتھ میں پیسے دے دئے۔

"اچھا اب بیس سال کے بعد ہم آپ سے پھر ملاقات کریں گے!" یہ کہہ کر انسپکٹر صاحب کار میں بیٹھ گئے اور کار روانہ ہو گئی۔

سیٹھ جی کو ہوش آیا تو اُن کے چاروں طرف ایک خوفناک اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس اندھیرے میں اُن کو دو چمکتی ہوئی چیزیں اپنی ہتھیلی پر نظر آئیں ——— ایک روپیہ اور ایک دوئنی!

یہ شاید ایک دوسرے مہاجنی سفر کی ابتدا تھی!

دعا

(۱۹۴۱ء)

دن رات دعائیں مانگتا ہوں مگر بے کار! نمازیں پڑھتا ہوں اور دامن پھیلا پھیلا کر خدا کے سامنے گڑگڑاتا ہوں، لیکن سب بے سود!

آرزوئیں پامال ہیں اور تمنائیں ناکام! زندگی محرومیوں اور بے نصیبیوں کی ایک داستان ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتی۔ "دعا" نے "اثر" کے ساتھ ایک مستقل دشمنی ٹھان رکھی ہے۔

پھر یہ نہیں کہ کبھی دعا قبول ہی نہیں ہوئی۔ ہوئی ہے، اور بارہا ہوئی ہے۔ اور ایک دفعہ تو ایسی ہوئی ہے کہ...... بس اب کیا کہوں! خدا کی شان بڑی ہے! وہ چاہے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اُس کی رحمت جوش میں آجائے تو بگڑے کام خود بخود بنتے چلے جاتے ہیں۔ یہ اُسی کا ابرِ کرم ہے جس نے ایک دفعہ میری بے کسانہ دعاؤں پر اثر کی بارشیں کر دی تھیں، اور عاجزانہ التجاؤں پر قبول و پذیرائی کے دروازے کھول دیئے تھے۔ میں اپنے معبود کی اُس

بے پایاں بندہ نوازی کو عمر بھر دل سے نہیں بھلا سکوں گا۔

مَیں اُس وقت تیرہ چودہ سال کا ایک نحیف، کمزور اور ناتجربہ کار لڑکا تھا۔ اس عمر کے لڑکے عام طور پر اچھے خاصے ہوشیار ہوتے ہیں۔ لیکن میں ایسا نہ تھا۔ دسویں جماعت میں پڑھتا تھا اور سب سے اچھا طالب علم خیال کیا جاتا تھا۔ مگر وہ ہوشیاری اور عیاری جس کو ذرا نرم لفظوں میں دنیادی سوجھ بوجھ کہہ سکتے ہیں۔ مجھ میں نام کو بھی نہ تھی۔ اس کی وجہ کچھ تو میری فطری سادہ لوحی تھی جس نے اب تک میرا پیچھا نہیں چھوڑا ہے، اور کچھ وہ حالات جن کے ماتحت میں نے تربیت پائی تھی۔ مَیں (بقول کسی کے) گھونسرے میں پلا تھا۔ زندگی کے تیرہ چودہ سال گھر کی چاردیواری کے اندر گزار دیئے تھے۔ الہ آباد کے صرف دو چار محلّوں اور بازاروں سے واقف تھا۔ بہادر گنج میں رہتا تھا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ دارا گنج کہاں ہے اور کوکر گنج کدھر ہے۔ پڑوس میں رہنے والے لڑکوں سے ملنے جلنے کی مجھے اجازت نہ تھی۔ نہ اسکول کے ساتھیوں کے ساتھ کہیں آجا سکتا تھا۔ غرضکہ میری دنیا بہت محدود تھی، اور اس محدود دنیا کے باہر جو لامحدود دنیا ادھر سے اُدھر تک پھیلی ہوئی تھی، اُس سے میں بالکل بیگانہ تھا۔ اگر کبھی بھولے بھٹکے گھر سے ذرا دور نکل جاتا تو ایک نامعلوم سی ہیبت دل پر طاری ہوجاتی اور سڑک پر چلنے والا ہر شخص ایک ہوّا معلوم ہوتا۔

تو یہ تھا میں! اس وقت جب میری عمر تیرہ چودہ سال کی تھی۔ اس سے کوئی دو سال پہلے۔ یعنی جب میں گیارہ بارہ برس کا تھا اور آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا، تو ایک مرتبہ اپنے نانا کے ساتھ بنارس گیا۔ یہاں میری ایک بیوہ خالہ رہتی تھیں۔ ان کو مرے ہوئے اب دس سال سے اوپر ہوتے ہیں، لیکن میرے دماغ کے کسی گوشے میں اُن کی آنکھوں سے مسلسل ٹپکنے والے آنسوؤں کا منظر اب بھی ایک دردناک یاد بن کر محفوظ

ہے۔ میں نے اُن کی آنکھوں کو ہمیشہ آنسوؤں سے تر دیکھا۔ وہ رونے کی اس قدر عادی ہو چکی
تھیں کہ مجھ سے بات کرتیں تو محض احساسِ محبت سے بھی اُن کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔
میں نانا کے ساتھ بنارس گیا تھا۔ وہ مجھے بنارس پہنچا کر کہیں اور چلے گئے، اور چند روز
بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ میں بنارس سے الٰہ آباد واپس کس کے ساتھ جاؤں۔ مجھے اچھی طرح
یاد ہے کہ اُس وقت جب یہ مسئلہ درپیش تھا خالہ نے میری بلائیں لیں اور آنکھوں میں
آنسو بھر کر کہا، "میرا لال اب آٹھویں درجے میں آ گیا ہے۔ دو برس بعد دسواں پاس
کرلے گا۔ پھر الٰہ آباد سے اکیلا بنارس آجایا کرے گا۔"

لیکن میں نے دسواں پاس کرنے سے چند ماہ قبل ہی اپنے آپ کو الٰہ آباد سے
بنارس اور بنارس سے الٰہ آباد تک تنہا سفر کرنے کے قابل محسوس کیا۔ اسکول میں
پانچ چھ دن کی چھٹی ہوئی تو اماں کی خوشامد کر کے خالہ کے ہاں جانے کی اجازت حاصل
کر ہی لی۔

اماں نے چلتے وقت مجھے چھ روپے دیئے — چار روپے دونوں طرف کا کرایہ
اور دو روپے اوپری خرچ کے لئے۔ گھر سے اسٹیشن جاتے ہوئے راستے میں میں نے
طے کیا کہ یہ دو روپے صاف بچا لاؤں گا، اور الٰہ آباد آ کر ایک عمدہ ساٹینوں کا سٹ
خرید دوں گا۔ اسٹیشن پہنچا تو معلوم ہوا کہ گاڑی کی روانگی میں ابھی بہت دیر ہے۔ گھر
سے کھانا کھا کر چلا تھا، مگر "ٹی سٹال" پر کیک اور انڈے مجسم دعوتِ کام و دہن
بنے ہوئے رکھے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی بھوک لگ آئی۔ ٹینوں کے سٹ کا خیال نہ رہا۔
سیدھا سٹال پر گیا اور چائے کی ایک پیالی طلب کی۔ کیک اور انڈے کے متعلق یہ
تو میں طے کر چکا تھا کہ ان دونوں میں سے صرف ایک چیز کھاؤں گا۔ مگر ابھی یہ فیصلہ کرنا

باقی تھا کہ کون سی چیز کھائی جائے۔ میں اس سلسلے میں اپنے دل سے مشورہ کر ہی رہا تھا کہ سٹال والے نے کہا، "کچھ کھائیے گا صاحب؟ کیک؟ پیسٹری؟ انڈا؟"

میں نے جواب دیا، "ہاں ایک انڈا اور ایک کیک کا ٹکڑا۔"

اُس نے ایک پرچ میں ایک اُبلے ہوئے انڈے کی قاشیں اور دوسری میں کیک کے تین چار ٹکڑے رکھ کر دونوں پرچیں میرے سامنے رکھ دیں۔ میں نے دل میں کہا، "عجب نامعقول شخص ہے یہ! اتنا بہت سا کیک میں نے کب مانگا تھا؟ اب اس سے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ بھئی ہمیں کیک کا صرف ایک ٹکڑا چاہیئے۔ بڑی ذلت کی بات ہو گی۔" غرضکہ کیک کے سب ٹکڑے کھانے پڑے۔ اور ایمان کی بات یہ ہے کہ اُن کے کھانے میں بڑا لطف آیا، اتنا کہ مجھے سٹال والے سے کوئی شکایت نہ رہی۔ اس ناشتے کی قیمت مجھے تقریباً آٹھ آنے دینی پڑی۔

سٹال سے رخصت ہوتے ہوئے میں نے اپنے دل میں کہا، "ٹینوں کا سِٹ تو ڈیڑھ روپے میں بھی خریدا جا سکتا ہے۔ اب میں ایک پیسہ خرچ نہیں کروں گا اور اس رقم کو بالکل محفوظ رکھوں گا۔"

روانگی کا وقت قریب آیا تو گاڑی میں جا کر بیٹھ گیا۔ پلیٹ فارم پر خوانچے والوں کا ہجوم شروع ہوا۔ ایک مٹھائی والے کی ٹوکری میں گلاب جامنیں نظر پڑیں۔ شیرے میں تر اور نہایت سُرخ! جیسے دہکتے ہوئے انگارے! دیکھتے ہی منہ میں پانی بھر آیا۔ مٹھائی والے کو بلانا بھی نہیں پڑا۔ وہ میری للچائی ہوئی نظروں کو دیکھ کر خود ہی میری طرف آ گیا۔

"کچھ مٹھائی دوں میاں؟"

"ہاں، کیا کیا چیز ہے؟"

"بالوشاہی — قلاقند — امرتی — گلاب جامن — اندرسے کی گولیاں —"

"اچھا، گلاب جامن دو۔"

"کتنی دوں؟ سیر بھر؟"

"نہیں، پاؤ بھر دیا دو۔"

میرا ارادہ تھا کہ صرف ایک آنے کی لوں گا لیکن اُس نے سیر بھر کہا تو مجھے یہ کہتے ہوئے شرم آئی کہ نہیں، ایک آنے کی دو۔ ناچار پاؤ بھر مانگ لی۔ سیر بھر چیز کے مقابلے میں پاؤ بھر کچھ ایسی بہت کم اور حقیر نہیں ہوتی!

گلاب جامنوں کو مزے لے لے کر کھایا اور اس کے بعد اپنی حماقت پر افسوس کرنے لگا۔

راستے میں بڑے زور کی پیاس معلوم ہوئی۔ ایک اسٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو پانی کی جستجو میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ ایک شخص مسافروں کو اوک سے "ٹھنڈا جل" پلا رہا تھا۔ میرے لئے اوک سے پینا ناممکن تھا۔ گلاس بھی نہیں تھا کہ اس میں لے کر پی لیتا۔ اتنے میں ایک سوڈے برف والا تیزی کے ساتھ جاتا ہوا دکھائی دیا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے اُس کو آواز دی اور وہ قریب آیا تو اُس سے کہا، "ایک بوتل کھول کر لاؤ۔"

"کون سی؟" اس نے سوال کیا۔

مجھے لیمنڈ اور جنجر دو نام آتے تھے۔ سوچ رہا تھا، اِن دونوں میں سے کون سا نام لوں کہ اُس نے کہا، "ومٹو؟"

میں نے کہا، "ہاں، وہی!"

پینے کے بعد میں نے ایک چونی اُس کو دی۔ خیال تھا کہ یہ ڈھائی آنے واپس کرے گا۔

لیکن اُس نے کہا، " دو آنے اور دیجئے"۔ حجت کرنا میرے لئے باعث شرم تھا، اس لئے بلا تامل جیب سے دوئی نکال کر اُس کو دیدی۔

باقی تمام سفر اپنے اوپر لعنت بھیجنے میں صرف ہوا۔

بنارس پہنچا ہوں تو دو روپے میں سے ایک روپیہ کا صفایا ہو چکا تھا۔ میں نے حسرت کے ساتھ بٹنوں کے اُس سٹ کو یاد کیا جو اب میری دسترس سے بہت دور تھا۔ لیکن پھر اپنے آپ کو سنبھالا اور عزم کیا کہ اب جو ایک روپیہ باقی ہے اُس میں سے ایک کوڑی خرچ نہیں کروں گا، اور الہ آباد پہنچ کر کچھ دنوں تک پیسے جمع کروں گا، اور پھر جب دوبارہ اپنے پاس دو روپے اکٹھے ہو جائیں گے تو ایک عمدہ سا بٹنوں کا سٹ خریدوں گا۔

لیکن میں اِس عزم کو نباہنے میں کامیاب نہ ہوا۔ دو ہی دن کے اندر وہ ایک روپیہ میری جیب سے نکل کر بنارس کے سوداگروں کی متاع بن گیا۔

اب میرے پاس بنارس سے الہ آباد تک کا ٹکٹ خریدنے کے لئے دو روپے تھے۔ اُن کو میں کسی صورت سے خرچ نہ کر سکتا تھا چنانچہ دو دن تک بالکل کوئی چیز نہیں خریدی۔ نہ خریدنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ جب جیب میں پیسے تھے تو وہ اچھلتے تھے اور ہر قدم پر کچھ نہ کچھ خریدنے کو جی چاہتا تھا۔ اب جیبیں خالی تھیں تو جی بھی نہ چاہتا تھا۔ غرضکہ دو دن نہایت سکون کے ساتھ گزرے۔

مگر تیسرے دن صبح ہی صبح یہ خیال آیا کہ بنارس سے چلتے وقت خالہ بھی تو مجھے کچھ دیں گی۔ یہ میرے دل کی آواز تھی جو مجھے بہکا کر غلط راستے پر ڈالنا چاہتی تھی۔ میں نے اس کے جواب میں کہا، "ضروری نہیں کہ وہ مجھے کچھ دیں۔ ممکن ہے دیں، ممکن ہے نہ دیں"۔ دل نے کہا، "نہیں، ضرور دیں گی۔ تمھاری اماں تو کبھی کسی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹنے دیتیں۔ روپوں

کے علاوہ کپڑا لتّا بھی دیتی ہیں۔" میں نے کہا" اماں کی بات دوسری ہے۔ وہ ایک بیرسٹر کی بیوی ہیں، اور اُن کے دو بیٹے لاٹ صاحب کے دفتر میں ملازم ہیں۔ خالہ بیچاری بیوہ ہیں۔ اُن کے چار جوان بیٹے مر چکے ہیں اور پانچواں اپاہج ہے۔ وہ محلے کی بچیوں کو پڑھا کر دو وقت کی روٹی کھاتی ہیں۔ اُن کے پاس اتنا کہاں کہ وہ مجھے کچھ دیں۔" دل نے کہا" نہیں، وہ تمھیں ضرور کچھ نہ کچھ دیں گی۔ دو روپے نہیں تو ایک روپیہ تو ضرور ہی دیں گی۔ تیرے پاس کرائے کے جو دو روپے ہیں اُن میں سے ایک روپیہ تم بے دھڑک خرچ کر سکتے ہو۔"
میں نے کہا" خرچ تو میں کر لوں، اور میرا جی بھی یہی چاہتا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر خالہ نے کچھ نہ دیا تو؟ پھر میں کیا کروں گا؟ بنارس سے الہ آباد تک کیسے پہنچوں گا؟"
دل نے یقین دلایا" وہ دیں گی، کم سے کم ایک روپیہ تو ضرور ہی دیں گی۔"
یہ کشمکش جاری ہی تھی کہ گلی میں سے ایک پاٹ دار آواز آئی: "چاٹ! دہی بڑے کی چاٹ!"
میں نے اپنے دل کے مشورے کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔
پھر ظاہر ہے کہ جب ایک دفعہ روپیہ بھُنا لیا گیا تو چونسٹھ پیسوں میں سے ایک پیسے کا بھی بچنا نا ممکن تھا۔ آدمی چھت پر سے گرتا ہے تو زمین پر آ کر ہی دم لیتا ہے۔
چھ دن کے قیام کے بعد میں بنارس سے رخصت ہونے لگا تو میری جیب میں صرف ایک روپیہ تھا۔ چلتے وقت خالہ نے مجھے گلے لگایا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہنے لگیں، "میرا لال اتنے دنوں کے بعد آیا اور میں اسے کوئی اچھی چیز بھی تو نہیں کھلا سکی ___ میرے پاس رکھا ہی کیا ہے!" اتنا کہہ کر وہ زار و قطار رونے لگیں۔ اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ زمین میرے قدموں کے نیچے سے نکل گئی۔

گھر سے اسٹیشن تک کا راستہ اس طرح طے کیا جس طرح ایک مجرم قید خانے کی کوٹھری سے پھانسی کے تختے تک کا راستہ طے کرتا ہے۔ اُس وقت یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس بھری دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے، میں بالکل تنہا اور بے یار و مددگار رہ گیا ہوں، میرے ماں باپ مر چکے ہیں اور عزیز و اقارب سب ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔

اسٹیشن پہنچکر بنارس سے الہ آباد تک کا آدھا ٹکٹ لیا۔ اس کے علاوہ اور صورت بھی کیا تھی۔

اور اس وقت میرے دل سے ایک دعا نکلی: "معبود میرے حال پر رحم کر! میری بیچارگی اور بے بسی پر ترس کھا۔ میں اس وقت بڑی مصیبت میں ہوں۔ اس مصیبت کو تو ہی ٹال سکتا ہے۔" اس کے بعد میں نے نظریں آسمان کی طرف اٹھائیں اور اپنے آپ کو خدا سے قریب تر محسوس کرتے ہوئے کہا: "اللہ میاں! میں اب پانچوں وقت کی نماز پڑھا کروں گا۔ کبھی بھول کر بھی قضا نہیں کروں گا۔ اور بغیر وضو کے بھی کبھی نہیں پڑھوں گا۔ میں پکا وعدہ کرتا ہوں اللہ میاں! آئندہ ہرگز کوئی گناہ نہ کروں گا۔ اگر کوئی گناہ کروں تو تم اسی وقت مجھے جان سے مار ڈالنا۔ بس اس وقت مجھے بچالو۔ مجھ سے کوئی ٹکٹ نہ مانگے، اور اگر مانگے تو مجھے بارہ سال سے زیادہ کا نہ سمجھے!......"

اسی طرح دعا مانگتا، خدا کے سامنے گڑگڑاتا اور خوف کے مارے تھر تھر کانپتا پلیٹ فارم تک پہنچ گیا۔ شاید میری دعا قبول ہو رہی تھی۔ کیونکہ گیٹ پر مجھ سے کسی نے ٹکٹ نہ مانگا۔ گاڑی تیار تھی۔ ایک خالی ڈبہ نظر آیا۔ اسی میں بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ خالی ڈبے میں ٹکٹ چیکر کے آنے کا امکان بہت کم ہے۔ بہت دیر تک میں ڈبے کے ایک کونے میں چوروں کی طرح سہما ہوا بیٹھا رہا اور بار بار خدا سے التجا کرتا رہا: "اس وقت

مجھے بچالو اللہ میاں! میں پکا وعدہ کرتا ہوں، آئندہ ہرگز کوئی گناہ نہ کروں گا۔ کبھی بغیر وضو کے نماز نہیں پڑھوں گا.....‘‘

یکایک چار پانچ آدمی ڈبے میں داخل ہوئے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ حالانکہ وہ سب کے سب بے ضرر مسافر تھے اور اُن میں سے ایک بھی ٹکٹ چیکر نہ تھا۔ مگر عجیب قسم کے لوگ تھے وہ! صورتوں سے بالکل وحشی اور جنگلی معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے قد نہایت لانبے تھے اور جسم نہایت چوڑے چکلے! آنکھیں ڈراونی اور چہرے سیاہ! میلی میلی شلواریں اور بھدے بھدے کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ وہ غالباً سندھ یا پنجاب کے کسی علاقے کے لوگ تھے، کیونکہ جب انھوں نے بیٹھ کر باتیں شروع کیں تو اُن کی زبان اردو نہ تھی۔ وہ بہت کم بولتے تھے مگر جب بولتے تھے تو چاروں پانچوں بیک وقت بول اٹھتے تھے، اور اُس کے بعد پھر کچھ دیر کے لئے بالکل خاموش ہو جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے مٹی کی ایک ہانڈی میں بہت سے کنکر اور روڑے بھر لئے ہیں اور وقتاً فوقتاً اسے دونوں ہاتھوں میں لے کر زور سے ہلا دیتا ہے۔

گارڈ نے سیٹی دی اور گاڑی روانہ ہوئی۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اطمینان کا سانس لوں، ایک ٹکٹ چیکر چلتی گاڑی پر سوار ہو کر ڈبے میں آن موجود ہوا۔

مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میری جان نکل گئی!

وہ سیدھا میرے پاس آیا اور بولا، ’’ٹکٹ!‘‘

میں نے کہا،’’ میرا ٹکٹ میری اماں کے پاس ہے۔ وہ زنانے درجے میں ہیں۔‘‘

خدا کی جناب میں میری دعا قبول ہو رہی تھی جبھی تو اتنا اچھا جواب خود بخود میری زبان پر آ گیا۔

اُس نے ذرا سخت نظروں سے مجھے دیکھا اور پھر پوچھا، "تم کہاں جا رہے ہو؟"

"الہ آباد!" میں نے جواب دیا۔

"اچھا،" اُس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اس "اچھا" کا مطلب صاف طور پر ظاہر تھا: "گھبراؤ نہیں صاحبزادے! الہ آباد کے اسٹیشن پر تمہاری خبر لوں گا۔"

پھر وہ پلٹ کر اُن چاروں پانچوں کے پاس گیا جو وحشیوں کی طرح ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ اُس نے ٹکٹ کے لئے اُن کی طرف ہاتھ بڑھایا، مگر وہ بدستور ایک دوسرے کو گھورتے رہے۔

"ٹکٹ لاؤ،" اُس نے نہایت تند لہجے میں کہا۔

انھوں نے حد سے زیادہ بھدی اردو میں جواب دیا جس کا خلاصہ یہ تھا: "ہم میں سے وہ شخص جس کے پاس ہم سب کے ٹکٹ ہیں پانی پینے گیا تھا۔ گاڑی یکایک روانہ ہوگئی اور وہ بھاگ کر کسی دوسرے ڈبے میں بیٹھ گیا۔"

ٹکٹ چیکر نے اُن کی بات کا یقین نہیں کیا۔ اُس نے غصے میں آکر اُن کے خلاف نہایت سخت الفاظ استعمال کئے، اور جب اچھی طرح اپنے غصے کا اظہار کر چکا تو وہیں اُن کے پاس جم کر بیٹھ گیا تاکہ اگلے اسٹیشن پر گاڑی رُکے تو دوبارہ اُن سے ٹکٹ کا مطالبہ کرے۔ وہ وہاں بیٹھا ہوا اپنی قہر آلود نظروں سے ہر دو تین منٹ کے بعد اُن کی طرف دیکھتا تھا۔ مگر وہ اُس کی طرف دیکھے بغیر، بدستور ایک دوسرے کو وحشیوں کی طرح گھورنے میں مصروف تھے۔

گاڑی تیزی کے ساتھ اڑی چلی جا رہی تھی، اور میری دعا عرش کی جانب حجو پرواز

تھی "آج مجھے بچا لو اللہ میاں! میں آئندہ پانچوں وقت کی نماز پڑھا کروں گا۔ کبھی بھول کر بھی قضا نہیں کروں گا۔ اور بغیر وضو کے کبھی نہیں پڑھوں گا۔ میں تمھارا بہت ہی فرماں بردار بندہ ہوں اللہ میاں! ...."

گاڑی ایک اسٹیشن پر پہنچکر ٹھہر گئی۔ ٹکٹ چیکر نے بغیر اپنی جگہ سے اٹھے ہوئے اُن وحشیوں پر ایک کڑی نظر ڈالی جواب اور بھی زیادہ خوفناک انداز میں ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ پھر اُس نے گرج کر کہا "کہاں ہے وہ تمھارا ساتھی؟ بلاؤ اُسے اور ٹکٹ دکھاؤ۔"

انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ صرف ایک دوسرے کو اپنی لال لال آنکھوں سے دیکھتے رہے۔

ٹکٹ چیکر آگ بگولا ہو گیا، اور اپنی جگہ سے اُٹھ کر انتہائی غضب ناک لہجے میں بولا۔ "بدمعاش کہیں کے! میں تمھیں پولیس کے حوالے کروں گا ــــــ میں تمھیں جیل بھجوا دوں گا۔ ٹھہر تو جاؤ۔ تم نے سمجھا کیا ہے!" اور اسی طرح غصے کی آگ برساتا ہوا گاڑی سے اُتر گیا۔

مَیں ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے لگا "اب پولیس آئے گی،" میں نے اپنے دل میں کہا۔ "اور ان سب کے ساتھ مَیں بھی پکڑا جاؤں گا۔ اُف، خدا کی پناہ! اللہ میاں! رحم کرو۔ مجھے بچا لو۔ میں تمھارا بہت ہی فرماں بردار بندہ ہوں۔ آج مجھے بچا لو۔ میں عمر بھر کوئی گناہ نہیں کروں گا......"

اور وہ بدمعاش جنھوں نے ٹکٹ چیکر کو غصہ دلا کر میری مصیبت میں اضافہ کیا تھا، اُسی طرح خون آلود نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ البتہ کنکروں سے بھری ہوئی ہانڈی کو کبھی کبھی زور سے ہلا دیا جاتا تھا۔

گارڈ نے سیٹی دی، اور عین ہمارے ڈبے کے سامنے آکر ہری لالٹین دکھائی مگر قبل اس کے کہ گاڑی رینگنا شروع کرے، ٹکٹ چیکر واپس آگیا۔ وہ تنہا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی پولیس کا آدمی نہ تھا۔

اس نے بیٹھتے ہی اپنے غضب ناک لہجے میں بولنا شروع کیا: "میں آج تمھارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ سمجھے تم، بدمعاشو! ڈاکوؤ! تم نے مذاق سمجھا ہے! میں تمھیں ٹھیک کر دوں گا، حرام زادے کہیں کے! بدمعاش!....."

گاڑی رات کی تاریکی کو چیرتی ہوئی تیزی کے ساتھ چلی جا رہی تھی، ٹکٹ چیکر کی زبان بھی اسی قدر تیزی کے ساتھ چل رہی تھی۔ بے ٹکٹ مسافروں کی شربار آنکھیں اور میری عاجزانہ دعائیں غیر معمولی شدت کے ساتھ مصروف عمل تھیں۔

کنکروں سے بھری ہانڈی ایک دفعہ بہت زور کے ساتھ ہلی۔ ابھی میں اس جھنکار کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ ان چاروں پانچوں آدمیوں میں سے ایک شخص یکایک اپنی جگہ سے اٹھا۔ کوئی چمکدار چیز بجلی کی طرح فضا میں لہرائی اور ٹکٹ چیکر کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ دوسرے لمحے میں وہ سب کے سب اس پر پل پڑے۔ انھوں نے اس کو ہاتھوں میں اٹھایا اور کھڑکی کے راستے سے باہر پھینک دیا۔

وہ تھوڑی دیر تک خاموشی کے ساتھ کھڑے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر ایکبارگی سب کی نظریں میرے اوپر جم گئیں۔ میں اپنی اس وقت کی حالت کو بیان نہیں کر سکتا۔ مگر اتنا یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان چند لمحوں میں میں احساس سے بالکل عاری ہو گیا تھا، کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو میں لازمی طور پر خوف اور دہشت کے احساس سے مر گیا ہوتا۔

وہ سب میرے قریب آئے، اور اُن میں سے ایک نے آگے بڑھ کر مجھ سے کہا،
"تم کہاں جاتے ہو؟"
مجھ میں بولنے کی طاقت نہ تھی، مگر منہ سے کسی نہ کسی طرح "الہ آباد" کا لفظ نکل گیا۔
وہ تقریباً ایک لمحہ مجھے گھورتا رہا۔ پھر بولا، "تم کسی کو یہ بات بولوگے؟"
"نہیں، میں کسی سے نہیں کہوں گا" میں نے نہایت عاجزی کے ساتھ جواب دیا۔
"اگر تم کسی کو بولے تو ......؟"
"نہیں ـــــ نہیں ـــ میں کسی سے نہیں کہوں گا" میں نے اُسے یقین دلایا۔
وہ پھر تقریباً ایک لمحہ مجھے گھورتا رہا۔ اُس کے بعد وہ سب کے سب میرے پاس سے چلے گئے اور اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئے۔
اور تب مجھے اپنی حالت کا احساس ہوا۔ میرا دل اس طرح دھڑک رہا تھا گویا سینے کی دیواروں کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ سارا جسم رات اور ریل کی سردی کے باوجود پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں اس حالت میں اپنی دعاؤں کو بالکل بھول چکا تھا (دعاؤں کی اب ضرورت بھی نہ تھی!)
اسٹیشن آیا اور گاڑی رُکی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اب ٹکٹ چیکر اپنی نیلے رنگ کی وردی پہنے ہوئے نظر آئے گا اور اُچھل کر ڈبے میں آن موجود ہوگا۔ لیکن فوراً خیال آیا کہ ٹکٹ چیکر اب کہاں! وہ تو یہاں سے دُور، جنگل کے سناٹے اور رات کی تاریکی میں، ریل کی پٹری کے برابر کہیں پڑا ہوگا۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ ٹکٹ چیکر نہ آیا اور گاڑی پھر چل پڑی۔
تھوڑی دیر میں الہ آباد کا اسٹیشن آیا۔ میں اپنی جگہ سے اُٹھا اور چاہا کہ ان خونی درندوں سے نظر ملائے بغیر ڈبے سے نکل جاؤں جواب پھر مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے

تھے۔ مگر وہ بھی میرے ساتھ ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے، اور میں نے پلیٹ فارم پر آ کر گیٹ کا رخ کیا تو میرے پیچھے پیچھے ہو لئے۔

گیٹ میں سے گزرتے وقت میں نے اپنا ٹکٹ جیب سے نکالا۔ ریل کے ہولناک واقعے کے بعد میں اُس کو بھول ہی گیا تھا۔ مجھے یہ بات بالکل یاد نہیں رہی تھی کہ میرے پاس صرف آدھا ٹکٹ ہے اور مجھ سے پورے ٹکٹ کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

میں نے ٹکٹ گیٹ پر کھڑے ہوئے ٹکٹ کلکٹر کو دیا، اور ٹکٹ دے کر آگے بڑھ جانے کی بجائے اس کا منہ تکنے لگا۔ اُس نے ٹکٹ کو دیکھا اور پھر مجھے دیکھا، سر سے پاؤں تک ایک نظر ڈالنے کے بعد اُس نے مجھے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

"یہ آدھا ٹکٹ کیوں ہے؟" اُس نے سوال کیا۔

"میرا تو آدھا ہی ٹکٹ لگتا ہے"، میں نے کہا۔

"نہیں، تمھارا پورا ٹکٹ لگے گا۔ آدھے ٹکٹ کے دام اور دو۔"

قبل اس کے کہ میں ٹکٹ کلکٹر سے کچھ اور کہوں، وہی شخص جس نے ریل میں خون کیا تھا آگے بڑھا اور اپنی جیب سے روپے نکالتے ہوئے بولا، "آدھے ٹکٹ کا دام کتنا ہوا؟"

ایک دوسرے ٹکٹ کلکٹر نے نصف ٹکٹ کی قیمت اور شاید اس کے ساتھ کچھ تاوان بھی وصول کیا، اور ایک رسید کاٹ کر اُس کو دی۔

پھر میرے خونی محسن نے اپنی جیب سے ایک ٹکٹ نکالا، گیٹ پر کھڑے ہوئے ٹکٹ کلکٹر کو دیا، اور مجھے ہاتھ سے پکڑے ہوئے پھرتی کے ساتھ اسٹیشن سے باہر آ گیا۔

باہر آ کر وہ مجھ سے علیحدہ ہو گیا۔ میں نے ایک ٹانگہ خالی دیکھا اور جلدی سے اُس

پر بیٹھ گیا۔

وہ دُور سے کھڑا مجھے دیکھتا رہا جب تک ٹانگا اُس کی نظروں کے سامنے رہا وہ برابر اپنی نظریں میرے اُوپر جمائے رہا۔ میں بھی کنکھیوں سے اُس کو دیکھتا رہا۔

وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ مجھے بے انتہا تھکن محسوس ہوئی ___ جسمانی اور دماغی تھکن! میں ٹانگے کی سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔

اور پھر مجھے اُس دُعا کا خیال آیا جو چند گھنٹے پیشتر میں نے خدا سے کی تھی۔

میری دعا قبول ہو گئی تھی!

کارسازِ حقیقی نے میری فریاد کو سُن لیا تھا! اُس نے میری عاجزانہ التجاؤں پر قبول و پذیرائی کے دروازے کھول دیئے تھے۔

اور اب؟ اب یہ حال ہے کہ دن رات دعائیں مانگتا ہوں مگر بے کار! نمازیں پڑھتا ہوں، اور دامن پھیلا پھیلا کر خدا کے سامنے گڑگڑاتا ہوں، لیکن سب بے سود! آرزوئیں پامال ہیں اور تمنائیں ناکام! زندگی محرومیوں اور بے نصیبیوں کی ایک داستان ہے جو ختم ہونے میں نہیں آتی۔ "دعا" نے "اثر" کے ساتھ ایک مستقل دشمنی ٹھان رکھی ہے!

لو ایک قصہ سنو!

(۱۹۴۱ء)

"میں بھاموییں نہیں رہ سکتا۔ ہندستان واپس آ رہا ہوں!"

چھوٹے بھائی کے متعدد خطوط جو اس مضمون پر مشتمل تھے برما سے آ چکے تھے میری کاہلی جواب لکھنے کی اجازت ہی نہ دیتی تھی۔ روز ارادہ کرتا تھا اور روز یہ ارادہ ملتوی ہو جاتا تھا۔ جب نصف درجن خطوط جمع ہو گئے اور یوں بھی اپنی خیریت کا خط لکھے بغیر کم و بیش دو مہینے گزر چکے، تو ایک دن غیر معمولی عزم سے کام لے کر کاغذ اور قلم دوات لے کر بیٹھا، اور تہیہ کر لیا کہ نہایت مفصل خط لکھوں گا اور انتہائی چرب زبانی اور دلائل آفرینی سے کام لوں گا تاکہ بنّن میاں ہندوستان واپس آنے کے خیال سے تائب ہو کر بھامو میں اپنا قیام جاری رکھنے پر مجبور ہو جائیں۔

بنّن میاں! خدا تمھیں خوش رکھے! تم خدا کو سرمایہ داروں کے دماغ کی پیداوار

سمجھتے ہو۔ لیکن میں اُس خدا پر ایمان رکھتا ہوں جس کا وجود سرمایہ داروں کے وجود سے بہت پُرانا ہے۔ اس لئے بھائی! میں تو اپنا خط اسی دعا سے شروع کروں گا کہ خدا تمھیں خوش رکھے، نیک اعمال کی توفیق دے، اور ایمان کی روشنی عطا فرمائے! آمین!

لو، ایک قصہ سنو! "ایمان کی روشنی"، پر یاد آگیا۔

بہت دنوں کی بات ہے۔ میں برسات کا لطف اٹھانے کے لئے مہرولی میں یوسف کے یہاں مقیم تھا۔ ایک دن قطب مینار کی سیر کو گئے۔ ہم لوگ ہانپتے کانپتے سیڑھیوں پر چڑھ رہے تھے۔ ہمارے پیچھے پیچھے نوجوانوں کی ایک ٹولی تھی، اور کہیں اُن کے قریب ہی کچھ برقع پوش عورتیں تھیں۔ عورتیں برقع پوش ضرور تھیں، مگر اُن کے چہرے بے نقاب تھے، اور وہ آزادی کے ساتھ ہنستی بولتی، قہقہے لگاتی، اور "او ئی اللہ"، اور "ہے ہے"، کرتی ہوئی غیر مردوں کے دوش بدوش سیڑھیاں طے کر رہی تھیں۔ ماحول کی تبدیلی بھی کیسی عجیب چیز ہوتی ہے بنّے میاں! ذرا غور کرنے کی بات ہے۔ یہی عورتیں جو شہری زندگی اور معاشری زندگی کی حدود میں رہتے ہوئے ہیں اپنی جھلک بھی دکھانا گوارانہ کرتیں، اب اُس زندگی سے دُور ــــ بلکہ بلند! ــــ ہو کر اپنے آپ کو کس قدر آزاد محسوس کر رہی تھیں! خیر، تو نوجوانوں کی اس ٹولی میں ایک بگڑے دل بھی موجود تھے۔ دو چار گوری چٹی صورتیں جو دیکھیں تو اُتر آئے شرارت پہ۔ اپنے کسی ساتھی سے بولے "اماں یار! روشنی تو یہاں بہت ہے۔ پھر لالٹینوں کی کیا ضرورت ہے؟" اُن عورتوں کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی۔ اُس نے پٹ سے جواب دیا، "میاں صاحبزادے! ایمان کی روشنی چاہیئے۔ یہ لالٹینیں تو بہت جلدی بجھ جائیں گی۔"، نہ پوچھو کیا حال ہوا سننے والوں کا۔ جتنے تھے سب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

کیا منہ توڑ جواب دیا ہے بڑھیا نے! کمال کر دیا۔ سچ مچ افلاطون کی نانی تھی کم بخت! تو غرض یہ ہے ننّھے میاں! کہ ایمان کی روشنی بڑی چیز ہے۔

اب تک جو کچھ لکھا گیا وہ تمہید کے طور پر تھا۔ اب کام کی باتیں سنو۔ ماموں جان کے خطوط سے اور خود تمہاری تحریروں سے یہ معلوم ہوا کہ بھاموں میں تمہارا جی نہیں لگتا، اور تم وہاں رہنا فضول سمجھتے ہو۔ میں نے اپنے پچھلے خط میں یہ لکھا تھا کہ تم اپنے آپ کو مطالعے میں مصروف کرو۔ اس سے اُن فائدوں کے علاوہ جو مطالعے سے حاصل ہوتے ہیں، ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ تم اپنا وقت آسانی سے کاٹ سکو گے۔ لیکن تم نے میرے اس خیال کو مہمل سمجھا۔ بات بھی ٹھیک ہے۔ پڑھنے سے تمہیں دلچسپی تھی ہی کب جواب ہوگی۔ جب طالب علمی کے زمانے میں نہیں پڑھا اور لغو سیاسی مشاغل میں وقت ضائع کیا تو اب کیا خاک پڑھو گے۔ تم کو پڑھنے کا مشورہ دینا واقعی ایک فضول اور مہمل سی بات ہے۔ مگر ننّھے میاں! تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ میں چونکہ بھاموں جیسے وحشت خیز مقام پر نہیں رہا ہوں، اور گھر سے نکل کر کہیں گیا ہوں تو انگلستان گیا ہوں، اس لئے تمہاری پریشانی اور بے لطفی کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ یقین مانو میں تمہاری دماغی حالت اور قلبی کیفیت سے اتنا واقف ہوں جتنے تم خود بھی نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ میں کوئی صاحبِ کرامات بزرگ ہوں اور غیب کا حال جانتا ہوں، بلکہ صرف یہ کہ میں بھی ان حالات سے دوچار ہو چکا ہوں۔ اور یہ آفت مجھ پر بھی بیت چکی ہے۔ تم نے میرے لندن جانے کا ذکر ناحق کیا۔ میں اس کی شکایت نہیں کرتا کہ تم نے میرے اوپر ایک ہلکی سی چوٹ کی اور ایک لطیف طنز سے کام لیا، بلکہ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے اپنی موافقت میں کوئی بات نہیں کہی۔

جو کچھ کہا میری موافقت میں کہا۔ سوچ سمجھ کر بات کیا کرو بنّن میاں! کیا تم نہیں جانتے کہ جس دن میں لندن پہنچا اُس کے دوسرے دن لندن سے متنفر ہو گیا اور وطن کی یاد میں آنسو بہانے لگا؟ تہذیب جدید کا یہ عظیم الشان مرکز اپنی گوناگوں رعنائیوں دلچسپیوں اور مصروفیتوں کے باوجود میری توجہ کو جذب نہ کر سکا۔ چنانچہ چندماہ نہایت بدمزگی کے ساتھ گزارے اور ہندوستان واپس آگیا۔ میری زندگی کے اس افسوسناک واقعہ سے تم کیا نتیجہ نکالو گے؟ یہی نا کہ پردیس میں جی کا لگنا پردیس کی رنگینی یا بے رنگی پر منحصر نہیں۔ اگر آپ بھاموں میں رہ کر وطن کے لئے بیقرار رہتے ہیں تو لندن میں بھی آپ کا یہی حال ہو سکتا ہے۔

بات یہ ہے بنّن میاں! کہ انسان جب اپنے وطن اور اہل وطن سے جدا ہو کر کسی اجنبی ملک میں جاتا ہے تو اکثر و بیشتر "ہوم سک،، ہو جاتا ہے۔ "ہوم سکنس،، ایک عام مرض ہے اور بہت سے "غریب الوطن،، اس بیماری کا شکار ہوتے ہیں۔ اس میں بچوں، بوڑھوں، مردوں اور عورتوں کی تخصیص نہیں۔ نہ بھامو اور لندن یا مسقط اور پیرس کی تخصیص ہے۔ لو ایک قصہ سنو!

میں جس زمانے میں لندن میں تھا اُس زمانے میں وہاں ایک ہندستانی رستوران "کوہ نور رستوران،، کے نام سے جاری تھا۔ یہ ٹاٹنہم کورٹ روڈ یعنی لندن کے عین مرکزی علاقے میں واقع ہے۔ دو بھائی جو ہماری اپنی دہلی کے ایک کائستھ گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اس کو چلا رہے تھے۔ میں تو لندن پہنچکر دہلی کے لذیذ اور چٹپٹے کھانوں کو ترس ہی گیا تھا۔ یہ حالت تھی کہ بریانی، شامی کباب، روغن جوش اور ٹیا محل کی نہاری کے مزے یاد آتے تو سچ مچ منہ میں پانی بھر آتا۔ چنانچہ

"کوہ نور"، کا کھانا میرے لئے حقیقتہً نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا تھا میں ہر دوسرے تیسرے دن کئی میل کا سفر کر کے وہاں پہنچا اور اُن کا ڈھائی شلنگ کا ڈنر کھاتا۔ کسی اور دن جاؤں یا نہ جاؤں، اتوار کو ضرور جاتا تھا، کیوں کہ اُس دن جلیبیاں بھی ڈنر کا ایک جزو ہوتی تھیں۔ تو بنّن میاں! قصہ یہ ہے کہ ایک اتوار کی شام کو میں وہاں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ اُس وقت میرے سوا وہاں کوئی اور نہ تھا، کیونکہ اصل میں ابھی ڈنر کا وقت نہیں ہوا تھا اور میں جلیبیوں کے لالچ میں ذرا وقت سے پہلے ہی پہنچ گیا تھا۔ میں نہایت اطمینان کے ساتھ کھانا کھانے میں مشغول تھا کہ ایک اور صاحب تشریف لائے۔ میں نے ایک نظر میں صرف اتنا دیکھا کہ وہ ہندوستانی ہیں۔ اس سے زیادہ دیکھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ مغرب کے بڑے بڑے شہروں میں لوگ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ دوسروں کو بے سبب گھورنا یا اُن کے کاموں میں دخل دینا وہاں بدتہذیبی خیال کی جاتی ہے۔ اور اصل یہ ہے کہ ان فضول باتوں کے لئے اُن کے پاس وقت بھی نہیں ہوتا۔ یہ صاحب آئے اور مجھ سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھ گئے۔ میں اپنے کھانے میں مشغول رہا اور ان کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ ایک آدھ اچٹتی ہوئی نظر اُن کے چہرے پر پڑ گئی ہو تو اُس کی مجھے خبر نہیں۔ تھوڑی دیر میں ویٹر آیا اور یہ پوچھنے کے لئے کہ آپ کے واسطے کیا چیز حاضر کی جائے اُن کے پاس گیا۔ جونہی اُن کے منہ سے پہلا لفظ نکلا میں چونک پڑا۔ میں اُن کی آواز پہچانتا تھا! آواز کو یاد رکھنے میں میرا حافظہ بہت اچھا کام کرتا ہے۔ لو ایک قصہ سنو!

یہ کوئی بارہ سال پہلے کی بات ہے۔ میں دہلی سے بریلی بڑے ابّا کے ہاں جا رہا تھا۔ علی گڑھ سے جو گاڑی ملی اُس میں بہت بھیڑ تھی۔ انٹر کچھا کھچ بھرا ہوا تھا۔

بڑی مشکل سے تھرڈ میں جگہ ملی۔ ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گئے۔ اتنی بھی گنجائش نہ تھی کہ آزادی کے ساتھ اِدھر اُدھر مڑ کر دیکھ سکیں۔ بس جہاں بیٹھے ہو وہیں بُت بنے بے حس و حرکت بیٹھے رہو۔ خیر بیٹھ گئے اور گاڑی چل پڑی۔ علی گڑھ کے اسٹیشن سے نکلے ہی تھے کہ ڈبے میں ایک سحر آفریں نغمہ بلند ہوا۔ کیا خبر تھی کہ مسافروں کی اس بھیڑ میں ایک جادو نوا مغنّی بھی ہے۔ یہ شخص مجھ سے بہت دور بیٹھا تھا، اور چونکہ میری پشت اس کی طرف تھی، میں اُس کو دیکھ بھی نہ سکتا تھا۔ دیکھنے کی میں نے کوشش بھی نہیں کی۔ اُس کے گانے کو ”سرودِ خانۂ ہمسایہ“ سمجھ کر سننے لگا۔ کیا بتاؤں اس کی بھاری آواز میں کتنا درد اور کتنی گھلاوٹ تھی۔ طبیعت پر نشہ سا چھا گیا۔ سفر کی ساری کلفت دور ہو گئی۔ علی گڑھ اور بریلی کے درمیان یہ شخص وقتاً فوقتاً گاتا رہا۔ اور اُس کے گانے کی وجہ سے سفر خاصا دلچسپ رہا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اتنے لمبے سفر کے دوران میں مَیں نے اُس کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھی۔ بریلی پہنچنے کے تین چار دن بعد شام کے وقت ہم سب، کوئی سات آٹھ آدمی، مکان کے سامنے چبوترے پر مونڈھے اور کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے۔ ایک صاحب جو اپنی وضع قطع سے ایک قلندرانہ شان کے بزرگ معلوم ہوتے تھے تشریف لائے۔ گٹھا ہوا جسم، گھنی سیاہ داڑھی، آنکھوں میں سرمہ، کالا تہمد اور گہرے کتھئی رنگ کا گھٹنوں سے نیچا کرتا۔ ــــ وہ یقیناً کوئی صوفی تھے۔ آتے ہی بڑے ابّا سے بغل گیر ہوئے اور بلند آواز سے باتیں کرنے لگے۔ میں اُن کی آواز سُن کر اچھل پڑا۔ مَیں نے کہا ”حضرت! میرا خیال ہے آپ تین چار دن ہوئے دوپہر کی گاڑی سے بریلی تشریف لائے تھے“۔ کہنے لگے، ”جی ہاں، آپ کو کیسے معلوم؟ آپ بھی شاید اُسی گاڑی سے آئے ہونگے“۔

میں نے کہا، "آیا تو میں بھی اسی گاڑی سے تھا، لیکن میں نے آپ کو دیکھا نہیں۔" "پھر آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ میں اُس گاڑی سے برلن آیا ؟" انھوں نے حیرت کے ساتھ سوال کیا۔ غرضکہ ان کے ساتھ بڑی دلچسپ گفتگو رہی، اور آخر میں جب میں نے انھیں بتایا کہ میں نے آپ کو آپ کی آواز سے پہچانا تو وہ بہت متحیر ہوئے۔ اُس کے بعد بڑی دیر تک ہم نے اُن کا گانا سُنا۔

تو بنّن میاں! بات یہ ہے کہ میں آدمی کو اُس کی آواز سے پہچان لیتا ہوں۔ "کوہ نور" میں بھی یہی ہوا۔ جونہی وہ صاحب بولے میں اُن کو پہچان گیا۔ وہ ڈاکٹر نفیر تھے جو کئی سال دہلی کے سول ہسپتال میں ہاؤس سرجن رہ چکے تھے۔ انھوں نے مجھے اپنی طرف غور سے دیکھتے ہوئے پایا تو وہ بھی مجھے پہچان گئے۔ فوراً بولے "آپ دہلی سے تشریف لائے ہیں ؟" میں نے کہا "جی ہاں، معاف کیجیے گا ڈاکٹر صاحب میں نے اب تک آپ کو پہچانا نہیں تھا۔" بولے "ہاں، میں بھی آپ کو نہیں پہچان سکا تھا۔" پھر میں نے کہا، "بہت کافی تبدیلی ہو گئی آپ میں دو تین مہینے کے اندر۔" انھوں نے لندن پہنچکر نہ صرف داڑھی منڈا دی تھی، بلکہ مونچھیں بھی صاف کر دی تھیں اور میرا اشارہ اسی تبدیلی کی طرف تھا۔ وہ ہنسنے لگے۔ "اور آپ پہلے کی نسبت کچھ دبلے بھی معلوم ہوتے ہیں ؟" میں نے اپنے تبصرے کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ کہنے لگے "جی ہاں، میری صحت یہاں آکر کچھ اچھی نہیں رہی۔ شروع میں دو تین مہینے تو "ہوم سک" رہا اور اب اکثر قبض کی شکایت رہنے لگی ہے......" "ہوم سک!" سنتے ہو بنّن میاں! ڈاکٹر نفیر لندن پہنچکر "ہوم سک" ہو گئے۔ اور دو تین مہینے تک "ہوم سک" رہے، اس قدر "ہوم سک" کہ اُن کی صحت پر بُرا اثر پڑا

اور صورت پہچاننی مشکل ہو گئی۔

مطلب یہ ہے کہ جب ایک شخص اپنے گھر سے دُور پردیس میں جا کر رہے گا تو وہ پردیس خواہ باغِ ارم ہو، خواہ ویرانہ، اُس کا "ہوم سِک" ہو جانا تقریباً لازمی ہے۔ جو لوگ تعلیم کے لئے یا کسی اور غرض سے یورپ جاتے ہیں اُن میں سے اکثر و بیشتر اس دماغی بیماری میں کم از کم کچھ دنوں کے لئے ضرور مبتلا ہو جاتے ہیں، حالانکہ یورپ کے وہ مقامات جہاں یہ لوگ جا کر ٹھہرتے ہیں رونق، چہل پہل اور گہما گہمی میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ بیماری عام طور پر دو ڈھائی مہینے رہتی ہے، اُس کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص جلد سے جلد اس کے اثر سے نجات پانا چاہے تو اس کی یہی صورت ہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں مصروف کرے اور کسی نہ کسی چیز میں دلچسپی لینا شروع کر دے۔ مصروفیت اور دلچسپی! مصروفیت اور دلچسپی! یہی دو چیزیں ہیں جو تمھاری بددلی کا علاج کر سکتی ہیں اور تمھاری بدمزگی کو دور کر سکتی ہیں۔ اور اسی بنا پر میں نے تمھیں لکھا تھا کہ تم اپنے آپ کو مطالعہ میں مصروف کرو۔

یوں بھی مطالعہ ایک اچھی اور ضروری چیز ہے۔ اگر تم مطالعے کو اپنے مشاغل کا ایک اہم جزو نہ بناؤ گے تو کیا دیس اور کیا پردیس، ہر جگہ تمھاری زندگی اجیرن ہو سکتی ہے۔ یار دوستوں کے ساتھ ہُوحق کرنے میں انسان —— ایک معقول انسان! —— اپنی ساری زندگی نہیں گزار سکتا۔ ایک وقت آتا ہے جب وہ اس روش سے اُکتا جاتا اور اُس کے فضول اور لغو ہونے کا قائل ہو جاتا ہے۔ لو ایک قصہ سنو!

اصل میں یہ کوئی قصہ نہیں ہے، بلکہ میں ایک مشہور مصنف کا قول دہرانا چاہتا

ہوں۔ سامرسٹ مام کا نام بھلا تم نے کاہے کو سنا ہوگا۔ وہ انگریزی زبان کا ایک بہت بلند پایہ ڈرامہ نگار اور افسانہ نویس ہے۔ اُس نے کسی جگہ لکھا ہے کہ صرف وہی لوگ بے دلی، افسردگی اور اکتاہٹ کا شکار ہوتے ہیں جو اندر سے کھوکھلے ہوتے ہیں، اور صرف گاؤدی قسم کے لوگ ہی اپنا دل بہلانے کے لئے خارجی دنیا کے محتاج ہوتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ دنیا میں بہ کثرت لوگ ایسے ہیں جو تعلیم یافتہ ہوتے ہوئے بھی علمی افلاس اور ذہنی بے مائگی میں مبتلا ہیں۔ وہ حصول مسرت کے ذرائع ہمیشہ خارجی دنیا میں تلاش کرتے ہیں، اور اسی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اُن میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ ان کی زندگی کے دن، مہینے اور سال گزرتے چلے جاتے ہیں، لیکن کبھی اس بات کی نوبت نہیں آتی کہ وہ اپنے دل کو ٹٹولیں، روح کی گہرائیوں کا جائزہ لیں، اور اندرونی کیفیات کا تجزیہ کریں۔ میرے نزدیک ایسے لوگوں کی زندگی گدھوں کی زندگی سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتی۔

اس لئے میرا مشورہ ہے منّی بیاں! کہ تم اس بات کا بالکل خیال نہ کرو کہ بھاٹو ایک ویران، پسماندہ، اور غیر مہذب مقام ہے۔ اپنے آپ کو مطالعے میں مصروف کرو اور کتابوں میں دل لگاؤ۔ تمھارے خالی لمحات کو پُر کرنے کے لئے مطالعہ بہترین چیز ثابت ہوگا۔ اور ہاں، ایک بات اور ذہن میں آئی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ دنیا کے ویران، پس ماندہ، اور غیر مہذب مقامات اپنے اندر کوئی دلکشی نہیں رکھتے؟ کیا بھاٹو میں انسانی زندگی اور انسانی معاشرت نہیں ہے جس کا مطالعہ کیا جا سکے؟ کیا وہاں صبح وشام کے مناظر، بہتے ہوئے دریا، کھلے ہوئے میدان، اور گھنے جنگل نہیں ہیں جن میں قدرت کی جلوہ آرائیوں کا مشاہدہ کیا جا سکے؟ مجھے یقین ہے کہ وہاں یہ

سب کچھ ہے اور کسی ذی ہوش انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہاں رہ کر ان چیزوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لے اور ایک تنگ و تاریک کمرے میں بیٹھ کر دہلی، لکھنو اور لاہور کی ہنگامہ پرور صحبتوں کی یاد میں ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرے اور اپنی محرومی پر آنسو بہائے۔ میں اس عقیدے کا انسان ہوں بنّن میاں! کہ آدمی اگر قطب شمالی پر بھی جاکر رہے تو اس کے پاس بیکار اور نکما رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ وہ وہاں بھی اپنا وقت مفید مشاغل میں گزار سکتا ہے۔ یاد رکھو دنیا میں بہت کم لوگ اتنے خوش قسمت ہوتے ہیں کہ ان کو گھر سے باہر نکلنے اور دنیا دیکھنے کا موقع ملے۔ پھر لائقِ افسوس ہیں وہ لوگ جن کو ایسا موقع ملتا ہے اور وہ اس سے فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ مجھے بھی قدرت نے ایک مرتبہ ایسا ہی بیش بہا موقع عطا کیا تھا۔ لیکن میں اس سے مستفید نہیں ہوا۔ کیونکہ میں اس وقت اتنا ہی نادان تھا جتنے کہ آج تم ہو۔ زندگی کو دیکھنے، سمجھنے اور محسوس کرنے کی جو تڑپ آج میرے اندر ہے وہ اس وقت نہ تھی حیاتِ انسانی کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر میرے چاروں طرف پھیلا پڑا رہا، لیکن میں نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔ اور آج یہ حالت ہے کہ گویا زندگی کے خشک ریتیلے ساحل پر ماہی بے آب کی طرح پڑا تڑپتا ہوں۔ افسوس! افسوس! افسوس! مگر اب افسوس کرنے سے بھی کیا حاصل؟ خدا سے دعا ہے بنّن میاں! کہ تمھیں اس طرح کبھی نہ پچھتانا پڑے!

بات سے بات نکلتی ہے۔ سیاحت و سفر کا ایک بہت بڑا فائدہ یاد آیا جن لوگوں کو اس بات کا موقع ملتا ہے کہ وہ گھر سے باہر نکل کر پردیس میں رہیں اور مختلف مقامات دیکھیں اُن میں ایک خود اعتمادی اور ذہن و کردار کی ایک پختگی پیدا ہو جاتی

ہے۔ اور یہ خوبیاں اُن لوگوں میں نسبتہً کم پائی جاتی ہیں جن کو سیر و سیاحت کے مواقع میسر نہیں آتے۔ لو ایک قصہ سنو!

ابھی پچھلے دنوں ناصر بھائی نے اپنے ایک عزیز دوست سلماتی صاحب سے میری ملاقات کرائی۔ وہ دریا گنج میں رہتے ہیں۔ ایک دن انھوں نے مجھے اور ناصر بھائی کو مع ہمارے چند دوسرے احباب کے ڈنر پر مدعو کیا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ کوٹ اور شیروانیاں اُتار کر بہت دیر تک اُن کے خانہ باغ میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ باتیں کرتے کرتے ناصر بھائی نے کہا "کیوں نہ ہم لوگ ذرا ٹہلتے ہوئے فیروز شاہ کے کوٹلے تک ہو آئیں؟" سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا اور مسٹر سلماتی نے بھی اجازت دے دی۔ رات کے نو بج چکے تھے اور یوں بھی دریا گنج سے فیروز شاہ کا کوٹلہ دور کتنا ہے! چنانچہ ہم سب جس طرح بیٹھے تھے اُسی طرح چلنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔ لیکن سلماتی صاحب نے کہا "ذرا ٹھہریئے میں ابھی آتا ہوں۔" اور کوٹھی کے اندر چلے گئے۔ میں سمجھا کپڑے پہننے گئے ہیں۔ مگر ناصر بھائی اور مسٹر سلماتی نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرنے لگے۔ ناصر بھائی مجھ سے بولے "جانتے ہو یہ کہاں گئے ہیں؟" میں نے کہا "میں تو نہیں جانتا۔" "اپنی والدہ سے اجازت لینے گئے ہیں"، ناصر بھائی نے کہا۔ "اجازت! کس بات کی اجازت؟" میں نے پوچھا۔ "اجازت اس بات کی کہ فیروز شاہ کے کوٹلے تک ٹہل آئیں"، ناصر بھائی نے ہنستے ہوئے کہا۔ مسٹر سلماتی بھی ہنسنے لگیں۔ میں اس مذاق کو خاک نہیں سمجھا۔ بیوقوفوں کی طرح اُن دونوں کا منہ تکنے لگا۔ بالآخر ناصر بھائی نے مجھے بتایا کہ سلماتی صاحب آج تک اپنی والدہ

کی اجازت کے بغیر کبھی گھر سے باہر نہیں نکلے۔ وہ کہیں جانے سے پہلے والدہ سے اجازت لینا ہمیشہ اپنا فرض خیال کرتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بچپن سے لیکر اس وقت تک کہ ان کی عمر چالیس سے متجاوز ہو چکی ہے کبھی دو چار دفعہ سے زیادہ دہلی سے باہر نہیں گئے، اور ہمیشہ گھر پر اپنی والدہ کے سایۂ عاطفت میں زندگی بسر کرتے رہے ہیں۔

کچھ سمجھے بنّن میاں! ہر چند کہ سلمانی صاحب کی یہ عادت کہ وہ گھر سے باہر جاتے وقت اپنی والدہ کی اجازت ضرور حاصل کر لیتے ہیں کوئی بری عادت نہیں ہے۔ مگر پھر بھی میں اس کو ان کے کردار کی بہت بڑی کمزوری خیال کرتا ہوں۔ میں ابھی ان سے صرف دو چار ملاقاتیں کر سکا ہوں۔ اگر ان ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا تو میں یقیناً ان کی اس کمزوری کا اور ان کی زندگی پر اس کمزوری کے اثرات کا اچھی طرح مطالعہ کر سکوں گا۔ مگر اس وقت بھی، یعنی کسی تفصیلی مطالعے کے بغیر اتنی بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ سلمانی صاحب خود اعتمادی سے بالکل محروم ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ صرف گھر سے باہر جانے کے لئے نہیں، بلکہ زندگی کے ہر اہم اور غیر اہم اقدام کے لئے اپنی والدہ کی اجازت حاصل کرتے ہوں گے۔ اور والدہ کی اجازت کے علاوہ بیوی سے بھی مشورہ کر لیتے ہوں گے۔ ممکن ہے بچوں کی رائے بھی لے لیتے ہوں۔ اور کچھ عجب نہیں جو نوکروں سے بھی صلاح کر لیتے ہوں۔ وہ تنہا اپنی ذمہ داری پر دنیا کا کوئی کام نہیں کر سکتے!

اور ان کی اس خوفناک کمزوری کا سبب؟ یہی کہ وہ کبھی کسی قابلِ ذکر مدت کے لئے گھر سے باہر نہیں رہے، انھوں نے کبھی کوئی لمبا، دور دراز کا سفر نہیں کیا،

اور اُن کو کسی ایک دن بھی یہ محسوس کرنے کا موقع نہیں ملا کہ آج میں اپنے عزیزوں، دوستوں اور غمخواروں سے دُور ہوں اور جو کچھ کر رہا ہوں اُس کا نتیجہ، بُرا یا بھلا، مجھی کو بھگتنا پڑے گا۔

اب تم خود سوچ لو بنّن میاں! کہ قدرت نے تمھیں برما کے سفر پر مجبور کر کے تمھارے ساتھ اچھا سلوک کیا یا بُرا، اور یہ کہ بھامو میں تمہارا قیام ضروری ہے یا نہیں۔

تم ہندستان آنے کے لئے بیقرار ہو۔ پوچھئے کیوں، تو جواب ملتا ہے کہ بھامو میں نوکری ملنے کی کوئی امید نہیں، اور اگر مل بھی سکتی ہے تو برسوں کے انتظار اور مدتوں کی امیدواری کے بعد! ماموں جان کے خطوط سے تمھارے ان خیالات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ وہ برابر یہی لکھ رہے ہیں کہ بنّن میاں کے لئے کوشش ہو رہی ہے اور خدا نے چاہا تو جلد کامیابی ہو گی۔ ماموں جان کا خدا بھی وہ خدا نہیں ہے جس کو تم سرمایہ داروں کے دماغ کی پیداوار سمجھتے ہو۔ اس لئے مَیں بھی اُن کے ساتھ اس امید میں شریک ہوں کہ جلد تمھیں کوئی اچھی ملازمت مل جائے گی۔ لیکن تھوڑی دیر کے لئے میں تمھاری بات مانے لیتا ہوں اور یہ فرض کئے لیتا ہوں کہ جیسا تم کہتے ہو، ویسا ہی ہے، یعنی یہ کہ بھامو میں نوکری ملنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ تو اب اِسکے بعد بھی میرا خیال یہی ہے کہ تمھیں بھامو میں رہنا چاہئیے، کیونکہ ہندستان میں نوکری ملنے کی امید اور بھی کم ہے۔

بات یہ ہے کہ تم ابھی تلاشِ معاش کے مصائب سے صحیح معنوں میں واقف نہیں ہو۔ دنیا میں لاتعداد نوجوان ایسے ہیں جو روزگار کی جستجو میں اِدھر سے اُدھر پھر رہے ہیں اور جانتے ہیں کہ اگر جلد سے جلد بلکہ فوراً کوئی ملازمت نہ ملی تو بھوک

اور فاقے سے مفر نہ ہوگا۔ جستجو اور تلاش تو اُسی کی ہے جو اس ہولناک احساس کے ساتھ اور اس بھیانک خوف کو دل میں لے کر نوکری ڈھونڈھے کہ اگر کل تک مجھے نوکری نہ ملی تو میں بھیک مانگنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ لو ایک قصہ سنو!

معین الدین میرا ایک بہت پرانا دوست ہے۔ جس زمانے میں ہم نیا ڑیے کے کوچے میں رہتے تھے وہ بھی وہیں رہتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بھی عربک اسکول میں پڑھتا تھا اور میں بھی۔ چنانچہ وہ اکثر ابا جان مرحوم سے انگریزی پڑھنے ہمارے گھر آیا کرتا تھا۔ تم اُس کو نہیں جانتے کیوں کہ تمھارے ہوش سنبھالنے سے پہلے وہ انٹرنس کا امتحان پاس کر کے علی گڈھ جا چکا تھا۔ اُس نے پانچ چھ برس میں علی گڈھ سے بی۔ اے کیا۔ اُس کے بعد ڈپٹی کلکٹری کے لئے مقابلے کے امتحان میں بیٹھا جب نتیجہ شائع ہوا تو اُس کا نام چوتھے نمبر پر تھا۔ اس سال چار آدمی لئے جانے والے تھے۔ بس پھر کیا تھا۔ معین صاحب کے ٹھاٹھ ہو گئے۔ فیسیں معاف کرا کرا کے تعلیم حاصل کی تھی، لیکن بی۔ اے کرتے ہی ڈپٹی کلکٹری ملی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں انگلستان سے واپس آچکا تھا اور گھر میں پڑے پڑے "بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے" کا ورد کیا کرتا تھا۔ یہ گویا نشے کے اُتار کی حالت تھی، اور طبیعت کی بے کیفی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی۔ معین کی کامیابی کی خبر سنی تو اپنی ناکامی کو دیکھتے ہوئے دل کچھ زیادہ خوش نہ ہوا۔ مجھے چاہیئے تھا کہ کم از کم ایک دفعہ جا کر اُس کو مبارک باد تو دے آتا۔ لیکن جی نہ چاہا۔ معلوم نہیں یہ رشک و حسد کا نتیجہ تھا یا یہ کہ مجھے ایک ایسے شخص سے ملتے ہوئے شرم آتی تھی۔ جو زندگی کی دوڑ میں مجھ سے بہت آگے نکل گیا تھا۔ کچھ بھی ہو، میں اُس سے ملنے نہیں گیا۔ اور میاں! ابھی یہ خبر تازہ ہی تھی کہ یکایک دوسری

خبر ملی۔ وہ یہ کہ معین صاحب ڈپٹی کلکٹری میں نہیں لئے گئے۔ ارے بھئی کیوں؟ یہ کیسے ہوا؟ پتہ لگا کہ فرقہ وارانہ تناسب کو قائم رکھنے کے لئے ایک عیسائی امیدوار کو لے لیا گیا جو بیسویں نمبر پر تھا، اور معین صاحب کو رد کر دیا گیا۔ یہ لیجئے، بنا بنایا محل گر پڑا۔ وہ پہلی خبر سن کر مجھے خوشی ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، لیکن یہ دوسری خبر سُن کر یقیناً رنج ہوا۔ خیر اس کے بعد بہت دنوں تک میں معین کے حالات سے بے خبر رہا۔ بس اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ نائب تحصیلداری، اکسائز انسپکٹری، اور اس قسم کی دوسری چیزوں کے لئے مقابلے کے امتحانات میں شریک ہوا، مگر کسی میں کامیابی نہ ہوئی۔ جب میں تین سال کانپور میں رہ کر دہلی واپس آیا تو ایک دن سر راہ اُس سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اُن دنوں ڈی۔ اے۔ جی۔ پی۔ ٹی کے دفتر میں چالیس روپے پر کام کر رہا تھا۔ مجھے یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ کہاں ڈپٹی کلکٹری اور کہاں چالیس روپے کی کلرکی اور وہ بھی عارضی۔ خیر۔ اب پچھلے ہفتے ایک مدت کے بعد اُس سے پھر ملاقات ہوئی۔ آج کل اجمیری دروازے سے باہر ایک عظیم الشان نمائش ہو رہی ہے اور وہاں بڑی رونق اور چہل پہل رہتی ہے۔ مَیں کسی شام ٹہلنے نکلتا ہوں تو اکثر و بیشتر قدم خود بخود اُسی طرف کو اٹھ جاتے ہیں۔ ایک دن، رات کے آٹھ ساڑھے آٹھ بجے مَیں ایک رستوران میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ یکایک میری نظر معین پر پڑی جو رستوران کے دفتر میں ایک کرسی پر مالکانہ اقتدار کے ساتھ بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ "کمال کرتا ہے یہ شخص بھی!" میں نے اپنے دل میں کہا، "اب کلرکی کرتے کرتے رستوران کھول بیٹھا،" چائے ختم کر کے میں سیدھا اس کے پاس گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اُچھل پڑا اور بوکھلا سا گیا۔ "کہو بھئی معین!" میں نے کہا، "کیا حال چال ہیں؟ یہ رستوران کب

کھولا ؟" میرا سوال یکسر مہمل تھا، کیونکہ میں نے اُس کو وہاں بیٹھا دیکھ کر جو نتیجہ نکالا تھا وہ صحیح نہیں تھا۔ وہ ریستوران کا مالک نہیں بلکہ ایک ادنیٰ ملازم تھا، اور صبح سے شام تک وہاں بیٹھ کر بل بنانے کی خدمت اُس کے سپرد تھی۔ یہ معلوم کر کے میرے دل کو ایک دھکا سا لگا اور مجھے اُس کی حالت پر بہت زیادہ رحم آیا۔ لیکن میں نے کوشش کر کے اپنے جذبات کو ظاہر نہیں ہونے دیا، اور اپنے قدرتی انداز میں اطمینان کے ساتھ باتیں کرتا رہا تاکہ وہ یہ سمجھے کہ میرے نزدیک اس کا ریستوران میں ملازم ہونا کوئی افسوسناک اور رحم انگیز بات نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ جو خفّت اس اچانک ملاقات سے اس کو ہوئی ہے، اُس میں مزید اضافہ کروں۔ مگر اس نے خود ہی اپنے روزگار کے متعلق گفتگو شروع کر دی۔ اُس کی ناکامیوں اور مصیبتوں کی داستان سن کر میرا تو دل ہل گیا۔ تقدیر کا کھیل دیکھئے کہ وہ شخص جو شاید ایک اعلیٰ سرکاری عہدے دار ہوتا، برسوں سے اس کوشش میں ہے کہ دو وقت کی روٹی کا اطمینان ہو جائے مگر کامیابی نہیں ہوتی۔ اُس کو اپنا مستقبل تاریک نظر آتا ہے۔ آج اسے اس بات کا بالکل غم نہیں ہے کہ وہ ڈپٹی کلکٹر ہونے کی بجائے ایک عارضی ریستوران میں دو وقت کے کھانے پر ملازم ہے۔ غم ہے تو یہ کہ پندرہ بیس دن بعد جب نمائش ختم ہو جائے گی اور ریستوران نہ رہے گا تو یہ دو وقت کا کھانا کہاں سے آئے گا! عبرت! عبرت! عبرت!

بنّن میاں! سچ پوچھو تو تم ابھی تلاشِ معاش کی تلخی سے دوچار ہی نہیں ہوئے اور خدا نہ کرے کہ کبھی ایسا وقت آئے! تمھارے روزگار کا مسئلہ کوئی بہت نازک اور پریشان کن مسئلہ نہیں ہے۔ زندگی کی ابتدائی ضروریات یعنی کھانا کپڑا وغیرہ

حسب دل خواہ پوری ہوتی رہتی ہیں، اور آئندہ بھی اُن کے پورا ہوتے رہنے کا امکان ہے۔ چنانچہ تم نہایت اطمینان اور سکون قلب کے ساتھ روزگار کی تلاش اور مستقبل کی فکر کر سکتے ہو۔ میرا مطلب ہے کہ تمھیں اس آرام اور عافیت کی قدر کرنی چاہیئے۔ بر ما گئے ہو تو اب وہاں رہ کر کچھ کام بھی کرو۔ اگر اس وقت اپرنٹس ہو سکتے ہو تو ضرور ہو جاؤ، چاہے آئندہ مستقل ملازمت ملنے کی اُمید بالکل نہ ہو۔ معاوضہ نہ ملے تو اُس کا بھی غم نہ کرو۔ کچھ نہیں تو تجربہ ہی حاصل ہوگا، دفتری کاموں کی نوعیت سے واقفیت پیدا ہوگی، معلومات میں اضافہ ہوگا، قابلیت بڑھے گی۔ اور کچھ نہیں تو رخصت ہوتے وقت ایک آدھ سرٹیفکٹ ہی لے لوگے۔ غرض یہ کہ اگر بلا معاوضہ نوکری بھی ملتی ہے تو تمھیں اُس کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیئے۔

اور جناب نے یہ کیا فرمایا کہ ہندستان کو جنگِ آزادی کے لئے سپاہیوں کی ضرورت ہے اور مَیں یہاں بیکار پڑا اسڑ رہا ہوں؟ واہ، واہ! کیا کہنے ہیں بنّن میاں! تمھارے! قربان جائیے اس بلند خیالی کے! مگر اتنی بڑی بات کہنے سے پہلے ذرا اپنے حالات پر تو نظر ڈال لی ہوتی۔ بادام چکے، گھر میں جو تھوڑی بہت پونجی تھی وہ ختم ہو چکی، بیوہ ماں اس انتظار میں جی رہی ہے کہ دیکھئے وہ دن کب آتا ہے جب صاحبزادے اپنے پیروں پر کھڑے ہوں اور دو وقت کی روٹی کمانے کے قابل بنیں۔ یہ تو جناب کے حالات ہیں اور بات وہ کہی ہے جو صرف مہاتما گاندھی اور جواہر لال ہی کے منہ سے نکلتی ہوئی اچھی معلوم ہو سکتی ہے۔ جنگِ آزادی کا سپاہی بننا آسان کام نہیں بنّن میاں! اس کے لئے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے اُن میں دولت سب سے اہم ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس سے تم یکسر محروم ہو۔ ایک مفلس اور قلاش نوجوان کو تو اِدھر

کا رُخ بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ لو، ایک قصہ سنو!
ہندو کالج میں میرے ساتھ ایک لڑکا بھگوان داس پڑھتا تھا۔ اُس کے سیاسی خیالات کچھ تمھارے جیسے تھے۔ لیکن تم نے تو (معاف کرنا بنّن میاں!) دو چار باتیں اِدھر اُدھر سے سُن لی ہیں جن کو تم وقتاً فوقتاً دہراتے رہتے ہو۔ اِس کے برعکس بھگوان داس نے سیاسی لٹریچر کثرت کے ساتھ اور محنت کے ساتھ پڑھا تھا۔ اُس کی زبان سے جو بات نکلتی تھی وہ ایک وسیع مطالعے اور عمیق فکر کا نتیجہ ہوتی تھی۔ ابتدا میں اُسکو فارسی سے بڑی دلچسپی تھی اور سعدی و حافظ کے سیکڑوں شعر یاد تھے۔ اردو سے بھی بہت شغف رکھتا تھا۔ اور یہی وہ چیز تھی جس نے مجھ کو اُس سے قریب تر کر دیا تھا لیکن اُس کا یہ شوق جلد ہی ختم ہو گیا، کیونکہ سیاسیات سے اُس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد بی۔ اے میں اُس نے فارسی نہیں لی، بلکہ انگریزی کے علاوہ تاریخ اور اقتصادیات لے کر مضامین کی مثلث کو پورا کیا۔ اب اُس کے خیالات میں ایک حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہونی شروع ہوئی۔ اردو فارسی ادب سے وہ بیزار ہو گیا جس ادب کا کبھی دیوانہ وار عاشق تھا اب اُسکو حقارت کے ساتھ "مڈل کلاس لٹریچر" کہنے لگا۔ یہی نہیں، اور بھی بہت سی چیزیں اب اُس کے نزدیک سرمایہ داروں اور دوسرے خوش حال طبقوں کی پیدا کی ہوئی اور بنائی ہوئی تھیں، مثلاً مذہب، مروجہ اخلاق، معاشرتی رسوم، مختلف سیاسی ادارے، فنونِ لطیفہ کے شاہکار، اور ان سب کو وہ قابلِ نفرت خیال کرتا۔ "پرائیوٹ پراپرٹی" (ذاتی ملکیت) کو وہ دنیا کی سب سے بڑی لعنت اور زندگی اور سماج کی ساری برائیوں کا سرچشمہ تصور کرتا۔ جنگ، غلامی، غریبی، جہالت، ہر چیز اُس کے نزدیک "پرائیوٹ پراپرٹی" کی پیداوار تھی، فرانسیسی مفکر

(مدیر پرودھن کا مشہور جملہ "پراپرٹی از تھفٹ" (ملکیت سرقہ ہے) ہر وقت اُس کی زبان پر رہتا۔ مجھ سے ملنے آتا تو دیوار پر کہیں نہ کہیں یہ جملہ ضرور لکھ دیتا۔ ایک دن مجھ سے بولا، "تم تاج محل کو کیا سمجھتے ہو؟" میں نے کہا "میں تاج محل کو ایک ایسی عمارت سمجھتا ہوں جو سنگ مرمر سے بنائی گئی ہے۔" کہنے لگا "میرا یہ مطلب نہیں میں یہ پوچھتا ہوں کہ تاج محل کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔" میں نے کہا "تاج محل کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ وہ دنیا کی سب سے خوبصورت عمارت ہے۔" "تو گویا وہ تمھارے نزدیک ایک لائق تحسین چیز ہے؟" اُس نے سوال کیا۔ میں نے کہا، "بے شک! وہ فنِ تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہے اور لائق صد تحسین ہے۔" "مگر میں اس کو قابلِ نفرت سمجھتا ہوں۔" اُس نے کہا۔ "ضرور سمجھو"۔ میں نے کہا "آج کل اچھی چیزوں کو بُرا کہنا بھی فیشن میں داخل ہے۔ ایک صاحب نے نگار میں ایک مضمون لکھا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غالبؔ جس کو اردو کا سب سے بڑا شاعر خیال کیا جاتا ہے دوسروں کے خیالات چرایا کرتا تھا اور اس لحاظ سے ایک معمولی درجے کا شاعر تھا۔" اُس نے میری بات کو غور سے نہیں سُنا اور اپنی کہے گیا: "میں تاج محل کو قابلِ نفرت سمجھتا ہوں۔ وہ اُس زمانے کی یادگار ہے جب بڑے بڑے جاگیردار، راجہ اور مہاراجہ کسانوں کو بے دردی کے ساتھ لُوٹتے تھے اور اُن کے خون سے اپنی محفلوں کو رنگین بناتے تھے......" "تمھارا خیال صحیح ہے۔" میں بیچ میں بول اُٹھا "لیکن تم ایک بات بھول رہے ہو۔ بھگوان داس! تم اس وقت اسٹیج پر نہیں ہو، بلکہ اپنے ایک دوست کے کمرے میں بیٹھے ہو۔ تم اپنے ماحول سے بڑی جلدی بے خبر ہو جاتے ہو۔ یہ تمھارے اندر بڑا عیب ہے۔" اُس نے جواب دیا،

"تاج محل ایک ایسے سیاسی و معاشی نظام کی پیداوار ہے جو" اِم مورل" تھا۔
بنیادوں سے لیکر چوٹی تک "اِم مورل"! اس لئے تاج محل بھی ایک "اِم مورل" چیز
ہے۔" میں نے کہا، "اگر "اِم مورل" ہے تو ہوا کرے۔ خوبصورت تو ہے۔ اور یہی اصلی
چیز ہے۔ ایک طوائف بھی "اِم مورل" ہوتی ہے، لیکن بعض اوقات وہ حسین بھی ہوتی
ہے، اور اُس کا "اِم مورل" ہونا اس کے حسین ہونے میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتا۔"
اِس پر وہ طوائف کا مسئلہ لے بیٹھا۔ کہنے لگا، "طوائف "اِم مورل" نہیں ہوتی۔
طوائف کو "اِم مورل" کہنا قطعی جہالت ہے۔ طوائف "پرائیوٹ پراپرٹی" کی پیداوار
ہے...." میرے نزدیک اُس کی گفتگو ہمیشہ ایک ہر لیہ نظم ہوتی تھی اور "پرائیوٹ
پراپرٹی" ٹیپ کا بند۔ جب وہ اس ٹیپ کے بند پر پہنچا تو میں اپنی ہنسی کو ضبط نہ
کر سکا اور ایک زور کا قہقہہ لگایا لیکن اُس نے اپنے کلام کا سلسلہ جاری رکھا:
"طوائف "پرائیوٹ پراپرٹی" کی پیداوار ہے۔ شادی کی رسم بھی "پرائیوٹ پراپرٹی"
کی پیداوار ہے، اور پردے کا رواج بھی "پرائیوٹ پراپرٹی" کی پیداوار ہے...
...." میں نے کہا "بھگوان داس! آج تمھارا بخار بہت تیز ہے، تھوڑی دیر خاموش
لیٹ کر آرام کرو۔" وہ اُٹھا اور مجھے جاہل، کوڑھ مغز اور نہ جانے کیا کیا کہتا ہوا کمرے
سے نکل گیا۔ جلدی میں وہ پنسل بھی چھوڑ گیا جس سے اُس نے میز پر پڑے ہوئے تقریباً
تمام کاغذات پر "پراپرٹی از تھیفٹ" کی مہر ثبت کر دی تھی۔

یہ تھا میرا دوست بھگوان داس اور یہ تھے وہ خیالات جو بھوت بن کر یکا یک
اُس کے سر پر سوار ہو گئے تھے۔ بہت جلد بھگوان داس جی اپنے مرکزِ ثقل سے اس
حد تک ہٹے کہ انھوں نے اپنی تعلیم کو خیرباد کہہ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے کہا،

"دیکھو بھگوان داس! اب تک جو بکواس تم وقتاً فوقتاً کرتے رہے ہو، اُس کو مَیں نے کبھی قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ لیکن یہ حرکت جو تم اب کرنے والے ہو ایسی نہیں ہے کہ میں خاموش رہوں۔ اگر تم نے اس وقت اپنی تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا تو یاد رکھو، زندگی بھر پچھتاؤ گے۔ یہ عمر پھر لوٹ کر نہیں آئے گی، نہ یہ مواقع جو آج تمھیں حاصل ہیں پھر میسر آئیں گے۔" اس پر وہ بولا، "مجھے بی، اے، ایم، اے کر کے کیا لینا ہے؟ حکومت کی نوکری تو کرنی نہیں ہے جو اپنی عمر اس طرح ضائع کروں۔" میں نے کہا، "چلو یونہی سہی۔ تمھیں حکومت کی نوکری نہیں کرنی ہے۔ مگر تحصیلِ علم بذاتِ خود بھی تو کوئی چیز ہے۔ علم کی اہمیت اور ضرورت سے تو تم انکار نہیں کر سکتے۔" "علم کی اہمیت موجودہ حالات میں کچھ بھی نہیں ہے،" اُس نے کہا، "بس اتنا ہی بہت کافی ہے کہ ہم اردو اور انگریزی لکھ پڑھ لیتے ہیں۔ اس سے زیادہ محض عیاشی ہے۔" "سبحان اللہ! کیا زریں خیالات ہیں!" میں نے کہا، "تمھارے دماغ میں خناس سما گیا ہے، بھگوان داس! اور کوئی بات نہیں ہے۔" لیکن اُس نے نہ کبھی میرے غصے کی پروا کی تھی نہ طنز و ملامت کی۔ چنانچہ حسبِ معمول اپنی کہے گیا: "کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنا ایک عیاشی ہے جو سرمایہ داروں کے لئے ہے، نہ کہ اُن لوگوں کے لئے جو دنیا میں آزادی اور انصاف کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔۔" میں نے سمجھ لیا کہ اس کا مرض حد سے گزر چکا ہے اور اس کو کوئی سنجیدہ مشورہ دینا بالکل فضول ہے۔

اُس نے کالج سے نام کٹوا لیا اور بمبئی جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اپنی اردو اور فارسی کی کُل کتابیں مجھے بخش دیں۔ ماں کو لکھ دیا کہ میں مزید تعلیم حاصل کرنا غیر ضروری

سمجھتا ہوں اور بمبئی جا رہا ہوں تاکہ مزدوروں میں رہ کر کوئی مفید کام کر سکوں۔ ماں بے چاری بے پڑھی لکھی عورت ...... وہ بیٹے کی اس عظیم الشان سیاسی بیداری کو کیا خاک سمجھتی اور کیا خاک اُس کی قدر کرتی۔ اُسے تو اپنی زندگی بھر کی آرزوئیں ہی پامال ہوتی نظر آئیں وہ ضلع رہتک کے کسی گاؤں میں ایک چھوٹی سی زمینداری سنبھالے بیٹھی تھی۔ مرحوم شوہر کی یاد اور اکلوتے بیٹے کے مستقبل کا تصور، یہی دو چیزیں اُس کی زندگی کا سہارا تھیں۔ اب جو بیٹے کے خوفناک ارادے کی خبر پائی تو بلبلا اُٹھی۔ خط پر خط لکھنے شروع کئے بھگوانداس کو سمجھایا بھی اور دھمکیاں بھی دیں، اپنے غصے کے نتائج سے بھی آگاہ کیا اور اپنی محبت کا واسطہ بھی دلایا۔ مگر اُس اللہ کے بندے پر کسی بات کا اثر نہ ہوا۔ اُس نے ہر خط کے جواب میں یہی لکھا: "والدین اور اولاد کی محبت سرمایہ دارانہ زندگی کا ایک عیاشانہ پہلو ہے۔ میرے دل میں دنیا کے عوام کی محبت ہے۔ اور میں اس محبت کے مقابلے میں ماں کی محبت کو ایک قطعی غیر اہم چیز سمجھتا ہوں،، آخر میں تنگ آکر ماں نے لکھ بھیجا، "اگر تم تعلیم ترک کر کے بمبئی گئے تو میں بھی اپنے دل پر پتھر رکھ لوں گی اور خرچ بھیجنا بند کر دوں گی" مگر یہ حضرت اپنے نئے خیالات کی ترنگ میں تھے۔ اُن پر مجاہدانہ سرفروشی کا جذبہ طاری تھا۔ انھوں نے ماں کی اس دھمکی کی ذرا بھی پروا نہ کی اور بمبئی روانہ ہو گئے۔

اس بات کو مشکل سے چار مہینے گزرے ہوں گے کہ ایک دن صبح ہی صبح کیا دیکھتا ہوں کہ بھگوان داس جی تشریف لئے چلے آرہے ہیں۔ قریب آئے تو دیکھا کہ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی ہیں، آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے ہیں، اور جسم پر ایک پھٹی ہوئی قمیص ہے، اور میلا کچیلا نیکر! " آئیے تشریف لائیے!" میں نے کہا" آپ کا نام بھگوان داس ہے نا؟" مگر وہ کسی چہل کے لئے تیار نہ تھا۔ بے جان ہو کر کرسی

پر گر پڑا اور بولا، "میں بیمار ہوں اور بہت بھوکا ہوں۔ جلدی سے گرم دودھ منگواؤ"۔
ناشتے کے بعد جب میں اُس کی داستان سننے میں مصروف تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ اکیلا نہیں آیا ہے بلکہ اپنے ساتھ کچھ خفیہ پولیس کے آدمی بھی لایا ہے۔ میں نے دل میں کہا، "یہ کم بخت کہیں میرے سر پر کوئی آفت نہ لائے۔ ایسے خطرناک آدمی سے دُور رہنا ہی بہتر ہے۔ دوستی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم بیٹھے بٹھائے اپنے آپ کو مصیبت میں پھنسائیں اور بے گناہ مارے جائیں"۔ میں نے جلد سے جلد اُس سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی اور تیسرے دن ٹکٹ دلوا کر رہتک روانہ کر دیا۔
اب قدرتی طور پر تم یہ جاننا چاہو گے کہ بھگوانداس پر بمبئی میں کیا بیتی اور وہ کیوں وہاں سے اس قدر جلد واپس آ گیا۔ لیکن یہ ایک طویل داستان ہے جس کو اگر میں بیان کرنے بیٹھوں تو بنّے میاں! میرا یہ خط خط نہ رہے گا بلکہ ایک اچھا خاصا ناول بن جائے گا۔ نہایت مختصر طور پر صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ بمبئی پہنچ کر بھگوانداس کو ایسی ذہنی و جسمانی تکالیف کا مقابلہ کرنا پڑا جو اُس کے لئے بالکل نئی تھیں۔ بھلا کہاں ایک نازوں کا پالا نوجوان اور کہاں سیاسی زندگی کے مصائب! ماں نے انتہائی خوشامد کے باوجود روپیہ نہیں بھیجا اور اس سے اُن مصائب میں چند در چند اضافہ ہو گیا۔ غرضکہ "دنیا کے عوام کی محبت" نے اچھی طرح اپنا اثر دکھایا اور بھگوانداس کو ایسے سخت جھٹکے دیئے کہ دن میں تارے نظر آنے لگے۔ "آزادی اور انصاف کی حکومت" قائم کرنے کا خیال ترک کر دیا۔ ماں کو لکھا، "روپیہ بھیجو، ہم دہلی واپس جا کر دوبارہ کالج میں داخل ہو جائیں گے"۔

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے ٭ پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

یہ نہ سمجھنا بٹن میاں! کہ بھگوان داس کی مصیبتیں یہاں ختم ہوگئیں۔ یہ تو اس کی بربادی کی محض ابتدا تھی۔ تعلیمی زندگی کا ایک سال ضائع کرنے کے بعد جب دوبارہ کالج میں داخل ہونے کے لئے آیا تو پرنسپل نے لینے سے صاف انکار کردیا۔ غریب نے بہتیرا سر پٹکا مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوا۔ مجبوراً لاہور پہنچا۔ وہاں جس کالج میں بھی گیا یہی جواب ملا کہ تھرڈ ایر میں داخل کریں گے۔ اُس نے فورتھ ایر سے پڑھنا چھوڑا تھا۔ اس لئے خیال تھا کہ فورتھ ایر ہی میں داخلہ مل جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ایک سال کی بجائے دو سال ضائع ہوتے ہوئے نظر آئے۔ طبیعت تعلیم سے پہلے ہی بیزار ہو چکی تھی، اِن نامساعد حالات سے دل اور بھی کھٹا ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مزید تعلیم کا خیال ہی چھوڑ دیا اور ملازمت کرنے کی جی میں ٹھانی۔ مگر ایسے شخص کے لئے ملازمت کہاں! خفیہ پولیس نے اب تک پیچھا نہیں چھوڑا تھا، ملازمت بھلا کون دیتا! دو تین سال کی دوڑ دھوپ کے بعد مناسب روش یہی معلوم ہوئی کہ خاموشی کے ساتھ اپنے وطن چلے جائیں اور بیوہ ماں کی خدمت میں زندگی بسر کریں۔

چنانچہ اُس وقت سے برابر ہمارے دوست شری بھگوان داس جی مستقل طور پر اپنے گاؤں میں رہتے ہیں۔ سال میں دو تین پھیرے دہلی کے کرتے ہیں اور ہر پھیرے میں چند کتابیں سیاسیات کی یا "مڈل کلاس لٹریچر" کی خرید کر لے جاتے ہیں۔ مطالعے سے جو وقت بچتا ہے وہ خطوط لکھنے اور حقہ پینے میں صرف ہوتا ہے۔

اُن کا وہ "پرائیوٹ پراپرٹی" والا فلسفہ مدت ہوئی کہ دھواں بن کے اُڑ گیا۔ اب اُن کے خیالات کا انداز کچھ اور ہے۔ دوسرے تیسرے مہینے مجھے خط لکھتے رہتے ہیں جس سے مَیں اُن کی ذہنی قلابازیوں کا اندازہ لگاتا رہتا ہوں۔ اس سلسلے میں

اُن کا سب سے آخری خط جو مجھے دو ماہ قبل موصول ہوا تھا خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں :۔ "میں تم سے ایک بات نہایت سنجیدگی کے ساتھ پوچھتا ہوں۔ کیا زندگی کا مقصد حصول مسرت کے سوا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے ؟ فرض کیجئے آپ نے دنیا میں رہ کر بڑے بڑے کام کئے۔ عزت بھی ملی اور نام آوری بھی ہوئی ایک دن آپ دنیا سے چل بسے۔ اب دنیا والے آپ کے نام کی مالا جپیں یا آپ کو غیر فانی بنانے کی کوشش میں مختلف مقامات پر آپ کے مجسّمے نصب کریں، آپ کو کسی بات سے کچھ سروکار نہیں۔ آپ تو چپکے سے کون جانے کہاں چل دئے۔ مرنے کے بعد معلوم نہیں آپ کا کیا ہوا۔ پھر بتلائیے کہ آپ کی وہ عمر بھر کی جدوجہد، تگ و دو، اور جانفشانی کس کام آئی۔ ہاں ایک چیز ہے جو کچھ معنی رکھتی ہے۔ اور وہ ہے مینائے حیات کا، بادۂ عشرت سے سرشار ہونا، یعنی دل کھول کر، پیٹ بھر کے، پوری طرح ڈوب کر زندگی گزارنا۔ لیکن یہ معموریت، جسم یا ذہن کو اذیّت اور کوفت میں مبتلا کر کے ہی کیوں حاصل کی جائے ؟ کسی شاہد رعنا کے آغوش میں کیا یہ چیز میسّر نہیں آسکتی ؟ میں شعراء میں خیام کے سوا کسی کو نہیں مانتا۔ باقی سب مہمل بکتے ہیں۔ زندگی کا راز اگر کسی نے پایا تو وہ یہی دیوانہ فرزانہ تھا....... میں اپنے چاروں طرف گل عذار بچے، زہرہ جبیں لڑکیاں اور حسین و رعنا لڑکوں کو دیکھتا ہوں۔ کل یہ نازک پھول کمھلا جائینگے۔ یہ دوشیزائیں پوپلے منہ والی کھوسٹ بڑھیاں بن جائیں گی۔ میرا ایک عزیز ہے۔ کیسا بانکا اور سجیلا جوان تھا وہ کبھی ! آج دق میں مبتلا ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ موت کا بھیانک چنگل اُس کی شہ رگ کے قریب آپہنچا ہے۔ یہ ہے زندگی کی حقیقت ! حسن کا ضیاع، مسرّت کا اختصار ــــ یہ فطرت کے وہ قانون ہیں جن کی علتِ غائی آج

تک کسی کی سمجھ میں نہ آسکی۔ دنیا ایک ماتم خانہ ہے! زندگی جنازہ بردوش ہے! میں شوپنہار کو زندگی کا سب سے عمیق مبصّر خیال کرتا ہوں.... فکرِ فردا اور غمِ دوش سے کچھ حاصل نہیں۔ کھاؤ، پیئو اور مزے اڑاؤ! جب موت آئے تو اطمینان کے ساتھ جان دے دو، اس اطمینان کے ساتھ کہ ہم نے اپنی زندگی کے لمحاتِ گراں کو بدذوقی اور بدتوفیقی کی نذر کر کے برباد نہیں کیا...... دنیا کے غریب؟ لیکن آپ کو اُن سے کیا؟ ہمدردی! آپ کو اُن سے ہمدردی ہے! خوب! مگر اُن کو آپ کی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ وہ جب چاہیں گے غاصبوں سے اپنا چھنا ہوا مال واپس لے لیں گے۔ ہمدردی منافقت کا دوسرا نام ہے! اخلاق! یہ اخلاق اور اس کی ذریّات کا تقاضہ ہے؟ ہوگا! مگر میں اِس فرسودہ اصطلاح سے بیزار ہوں کس قدر پوچ اور سوقیانہ تخیّل ہے!......"

تم نے دیکھا ننّھے میاں! یہ وہی شخص ہے جو کبھی تاج محل کو "ام مورل" کہا کرتا تھا، اور دنیا کی ہر اچھی بُری چیز کو سرمایہ داروں کی عیاشی کہکر قابلِ نفرت ٹھیراتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی کے متعلق بہت سے مختلف نظریے ہو سکتے ہیں اور ایک سوچنے سمجھنے والے انسان کے لئے نہایت دشوار ہے کہ وہ کسی ایک نظریے کا ہو جائے اور تا زیست اسی کا ہو کر رہے۔ پھر تمھیں بتاؤ کہ کسی مخصوص فلسفے کو زندگی کا صحیح ترین فلسفہ سمجھ کر اس کی خاطر اپنے مستقبل بلکہ اپنی ساری زندگی کو خطرے میں ڈال دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ بھگوان داس کے حالات سے تم یہ بھی معلوم کر سکتے ہو کہ سیاسی کام ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے بہت سی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے جن میں اقتصادی خوشحالی اور معاشی اطمینان سب سے زیادہ

اہم ہے۔ اگر تمھارے پاس یہ چیز نہیں ہے تو تم کبھی جنگ آزادی کے سپاہی نہیں بن سکتے۔ اور میاں! سپاہی وپاہی بننے کی نوبت ہی کہاں آتی ہے جس دن بھی ذرا اسی بے عنوانی کا اظہار تمھاری طرف سے ہوگا اُسی دن جیل میں ٹھونس دیئے جاؤ گے اب سال چھ مہینے تک پڑے سڑا کرو۔ بے اختیار یہی کہو گے کہ اس سے تو بھاڑ میں پڑے سڑتے رہتے تو بہتر تھا۔ اور یہ نہ سمجھنا کہ جیل میں آرام کے ساتھ گزرتی ہے اور کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔ یہ محض کہنے کی باتیں ہیں کہ سیاسی قیدیوں کو بہت سی مراعات ہوتی ہیں اور وہ ترجیحی سلوک کے مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ جو سلوک معمولی قیدیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے وہی سیاسی قیدیوں کے ساتھ بھی کیا جاتا ہے۔ مہاتما گاندھی اور جواہرلال کی بات دوسری ہے۔ تم جیسے آزادی کے سپاہیوں کو تو وہ ہتھکڑی پہنانے سے بھی نہیں چوکتے۔ لو ایک قصہ سنو!

کان پور میں مَیں جن صاحب کے مکان میں رہتا تھا وہ چمڑے کی تجارت کرتے تھے اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ بہت زیادہ مالدار تھے۔ مالدار ہونے کے علاوہ وہ اور بھی بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ لیکن اُن کا لڑکا نہایت پاجی تھا۔ مطیع اللہ نام! مگر اطاعت سے کوسوں دور! انتہائی کوششوں کے باوجود کم بخت نے کچھ پڑھ کے نہیں دیا۔ باپ نے روپیہ پانی کی طرح بہایا، اور جس اسکول میں وہ پڑھتا تھا اُس میں ہزاروں روپیہ بطور امداد کے دے ڈالا۔ مگر وہ کسی طرح ہائی اسکول کے امتحان میں پاس ہی نہ ہوا۔ جب عمر بہت زیادہ ہوگئی تو مجبوراً تعلیم ترک کرا دی گئی۔ اب اسے لیڈری کا شوق چرّایا۔ معلوم نہیں اُس کے دماغ میں سیاسی بیداری کے جراثیم کہاں سے آگئے۔ غرضکہ قومی وملکی کاموں میں حصہ لینا شروع کردیا۔ ایک

کپڑے کے مل میں اسٹرائک ہوئی تو آپ ماشاء اللہ اُن لوگوں میں تھے جو اپنے جھوٹے سچے دعوؤں اور اشتعال انگیز تقریروں سے مزدوروں کو بہکاتے اور ورغلاتے ہیں۔ اور اُن کو غلط راستے پر ڈال کر اُن کی مظلومیت میں مزید اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ نتیجہ جو ہونا تھا وہ ہوا۔ مع اپنے تمام ساتھیوں کے دھر لئے گئے۔ پولیس نے بے تامل ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ اُنھوں نے بہت ہیچر مچر کی مگر وہاں بھلا کون سنتا تھا۔ چار و ناچار سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ سب کو لاری میں ٹھونس دیا گیا اور لاری چل پڑی۔ لاری میں بیٹھتے ہی مطیع اللہ کو حاجت محسوس ہوئی۔ اُس نے پولیس افسر کو اپنی خواہش اور ارادے سے مطلع کیا۔ پولیس افسر نے اُس کی خواہش اور ارادے کو کمزور سمجھ کر کچھ اہمیت نہ دی، اور ڈانٹ کر کہا "ابھی نہیں، بیٹھے رہو! چند منٹ مطیع اللہ نے صبر کیا۔ مگر خواہش بہت قوی اور ارادہ نہایت مضبوط تھا۔ اس لئے زیادہ دیر تک صبر نہ کیا جا سکا۔

اُس نے پھر پولیس افسر کو یاد دہانی کرائی۔ وہ کم بخت نہایت ہی شقی القلب تھا۔ پھر ٹال گیا۔ مطیع اللہ نے کچھ دیر اور صبر کیا۔ لیکن اب خواہش کی قوت اور ارادے کی مضبوطی اس قدر شدید ہو گئی کہ دونوں میں سے کسی ایک کو نظر انداز کرنا نا ممکن معلوم ہوا۔ اُس نے تنگ آ کر پولیس افسر کو ایک ایسی دھمکی دی کہ وہ لاری روکنے پر مجبور ہو گیا۔ لاری جس جگہ رُکی وہ ایک غیر آباد سا مقام تھا۔ سڑک کے ایک طرف کچھ کچے پکے مکانات تھے اور دوسری طرف ایک وسیع میدان دُور تک چلا گیا تھا۔ مطیع اللہ لاری سے اُتر کر ایک پولیس مین کو اپنے ساتھ گھسیٹتا ہوا میدان کی جانب بھاگا۔ جب دونوں ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئے تو مطیع اللہ نے کہا "تھکڑی

کھولو — جلدی!" "ہتھکڑی تو میں نہیں کھول سکتا" پولیس مین نے کہا، "تمھارے پتلون کے بٹن کھولے دیتا ہوں"......

میں نے یہاں تک لکھا تھا کہ بنّن میاں کا ساتواں خط ملا:- "ہندستان میں ستیہ گرہ شروع ہو چکی ہے، اور میں تقریباً اس خط کے ساتھ ساتھ یہاں سے روانہ ہو رہا ہوں......"

اب میں اس کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں کہ بنّن میاں پر خاک ڈالوں اور تمام اردو داں طبقے کو اپنا مخاطب بنا کر کہوں:-

لو، ایک قصہ سنو!

غم نصیب

(۱۹۴۰ء)

عمر کے لحاظ سے تینتیس ۳۳ سال کا نوجوان، لیکن افکار و تردّدات کے اعتبار سے ساٹھ سال کا بوڑھا! بظاہر خوش حال اور فارغ البال لیکن دراصل نہایت غم زدہ اور دردمند!

وہ اپنی المناک زندگی کو بہلانے کے لئے کبھی کبھی سینما چلا جاتا ہے!

"کیا سینما گئے تھے؟ کیسا کھیل تھا؟"

سینما سے واپسی پر اپنی ماں سے کھیل کے متعلق باتیں کرنا اور اُس کے دیکھنے یا نہ دیکھنے کی بابت مشورہ دینا اُس کا دستور ہے۔ لیکن اُس دن وہ سینما سے واپس آیا تو بالکل خاموش تھا ___ اپنے بے پایاں غم کی سوگوار فضا میں کھویا ہوا! مجبور ہو کر خود ماں نے باتوں کا سلسلہ شروع کیا۔

"کیا سینما گئے تھے؟ کیسا کھیل تھا؟"

"کچھ نہیں اماں! ___ بالکل فضول اور مہمل!"

"کس کمپنی کا تھا؟" ماں نے سوال کیا۔

"یہ فلم بنانے والے بھی بالکل گدھے ہوتے ہیں۔ ذرا بھی تو شعور نہیں ہوتا ان کو! ایسی بے تکی باتیں اسکرین پر دکھاتے ہیں کہ گالیاں دینے کو جی چاہتا ہے یعنی اب جو بھی اندھا اپریشن کریں گے اُس کو بعد میں آنکھیں ضرور مل جائیں گی۔ یہ اِن کے نزدیک زندگی کی ترجمانی ہے....."

ماں نے اپنے مطالعے کی بنا پر بات کاٹ کر کہا، "ویسی ہی کہانی ہوگی جیسی اُس کتاب میں پڑھی تھی۔ کیا نام تھا اُس کا...."

"اب اس میں ایک اندھی عورت ہے اور ایک اندھا مرد۔ دونوں کی آنکھوں کا آپریشن ہوتا ہے اور بینائی واپس آجاتی ہے۔ لاحول ولا قوۃ! کیسی مہمل بات ہے! ہم نے تو دیکھا نہیں کسی اندھے کو دوبارہ آنکھیں مل گئی ہوں۔"

"ہاں نظر کمزور ہو جاتی ہے تو آنکھیں بنوائی جاتی ہیں اور فائدہ بھی ہوتا ہے۔ لیکن کوئی بالکل ہی اندھا ہو تو بھلا اُس کا کیا آپریشن ہوگا!"

"اگر ایسا ہی ہوا کرتا جیسا یہ لوگ فلموں میں دکھاتے ہیں ___ آپریشن کے ذریعے بینائی مل جایا کرتی ___ تو ہم بھی انیس کی آنکھوں کا آپریشن کرا لیتے۔"

"پھر وہی انیس کی آنکھیں! انیس کی آنکھیں! آخر کب تک انیس کی آنکھوں کا غم کرو گے؟ تم نے تو اپنی زندگی اجیرن کر لی۔ سینما کا ذکر بھی میں بھی انیس کی آنکھوں کو لے بیٹھے۔ اُس کی آنکھیں جاتی رہیں، خدا کو تھا۔ اب عمر بھر اُس کا سوگ منانا تو کوئی عقلمندی کی بات نہیں ہے!

اُس نے جواب میں خاموشی اختیار کر لی ــــ خاموشی جو در اصل ایک طویل آہ تھی
اُس وقت اُس کے ذہن میں یہ الفاظ گونج رہے تھے:۔

"تم کیا جانو اماں! تم ایک حساس اور بدنصیب باپ کے دکھ کو نہیں جان سکتیں
تم ایک عورت ہو، اور عورتیں فطرتاً صابر و شاکر ہوتی ہیں۔ ہندستان کی غم پرست
عورتیں! وہ غم کو اپنی ہستی کا جزو بنا لیتی ہیں اور اُس کو زندگی سمجھ کر ہنسی خوشی برداشت
کرتی ہیں۔ وہ غم کو غم ہی نہیں سمجھتیں۔ لیکن ایک باپ جو محبت بھرے دل کے ساتھ ایک
فلسفیانہ دماغ بھی رکھتا ہو، تقدیر پرستی کا یہ جذبہ کہاں سے لائے؟ وہ اپنی بیٹی
کے دکھ کو کس طرح نظر انداز کرے؟ اُس کے لئے اس دنیا میں سکون کہاں ہے
اماں؟ ۔۔۔۔۔۔"

وہ بے شک ایک فلسفی ہے، اِس معنی میں کہ سوچنے سمجھنے اور زندگی کی حقیقتوں
پر غور کرنے کا ایک فطری ذوق اُس کی طبعیت میں ہمیشہ سے پایا جاتا ہے۔ وہ ایک
قنوطی واقع ہوا ہے، اور اُس کا یہ میلان بھی بالکل پیدائشی ہے۔ چنانچہ اُس کا بچپن
دوسروں کے بچپن کی طرح بے فکری اور بے پروائی کا زمانہ نہ تھا جس عمر میں کہ بچے
عام طور پر کھیل کود اور بے معنی ہاؤ ہو کے سوا کوئی دوسرا شغل نہیں رکھتے، وہ
ایک بوڑھے مفکر کی طرح دنیا کو ایک غم کدہ اور زندگی کو ایک مصیبت ناک حادثہ
خیال کرتا تھا، اور گھنٹوں دکھی انسانیت کے آلام پر غور کیا کرتا تھا۔ بیماری، پیرانہ سالی
اور موت کے روح فرسا مناظر جس طرح راجکمار سدھارتھ کے لئے بیزار کن
ثابت ہوئے تھے، اسی طرح اُس کے لئے بے اندازہ غم و اندوہ کا موجب تھے۔
تاریخ ہند کا وہ صفحہ جس پر گوتم بدھ کے حالاتِ زندگی درج تھے وہ بار بار پڑھتا تھا۔

اور کبھی سیر نہ ہوتا تھا۔ اُن چند سطروں میں گویا اُس کے اپنے غم کی داستان مرقوم تھی۔

پھر وہ جوان ہوا۔ اُس کی جوانی کاونٹ ٹالسٹائی کی جوانی کی طرح بے چین اور غیر مطمئن تھی۔ اسے کہیں سکون نہ ملتا تھا، اور وہ روسی مفکر کی طرح خود کشی کے مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا کرتا تھا۔

جب وہ چودہ سال کی عمر میں انٹرنس کا امتحان پاس کر کے کالج میں داخل ہونے کے لئے گیا تو پرنسپل نے اُس کے داخلے کے فارم پر کھیل کے خانے کو خالی دیکھ کر سوال کیا، "تم کوئی کھیل نہیں کھیلتے؟"

"جی نہیں،" اس نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"اس لئے کہ کھیل کوڈ بے مغز انسانوں کا کام ہے، ذہین اور سنجیدہ آدمیوں کا کام نہیں۔"

بوڑھا پروفیسر چونک پڑا۔ اُس نے پھٹی ہوئی نظروں سے اِس "ذہین اور سنجیدہ" چھوکرے کو دیکھا۔ وہ خود بھی فلسفے کا عالم تھا اور کھیل کی نفسیات پر بڑے بڑے ماہرین علم النفس کی تصانیف کا مطالعہ کر چکا تھا۔ اُس کے نزدیک کھیل کے متعلق اِس لڑکے کا خیال جرات آمیز ہونے کے ساتھ ساتھ غلط اور مہمل بھی تھا۔ مگر آہ! وہ بوڑھا عالم جس کی فلسفیانہ علمیت کتابوں کی مرہونِ منت تھی اُس لڑکے کے احساس کو کیا جان سکتا تھا جس کے قلب و جگر میں سارے جہان کا درد سمایا ہوا تھا اور جو زندگی کو انسانیت کی ایک دل روز کراہ خیال کرتا تھا۔

اٹھارہ سال کی عمر میں اُس کی شادی ہو گئی، اور انیس سال کی عمر میں وہ

ایک بچی کا باپ بن گیا۔ لیکن ایک خوبصورت بیوی اور ایک پھول سی لڑکی کی محبت بھی اُس کو دردِ دل اور دردِ زندگی سے غافل نہ کرسکی، اور اُس کے دماغ کو سکون کی نیند نہ سُلا سکی۔ وہ بدستور بے چین اور دردمند رہا۔ اور پھر جب اُس کی بچی دو سال کی عمر میں اندھی ہوگئی اور بیوی عین اٹھتی جوانی میں دائمی مفارقت کا داغ دے گئی تو وہ جیتے جی موت کے منہ میں چلا گیا۔ اُس کی اُمید کی کشتی جو شکستہ بھی تھی اور نازک بھی، اس طوفان کے تھپیڑے برداشت نہ کرسکی اور پاش پاش ہو کر غرق ہوگئی۔

وہ یاس اور نامرادی کی آخری سرحد پر پہنچ گیا۔ اور اس عالم میں ایک دُکھ بھری آواز اُس کے منہ سے نکلی:۔ "میرے معبود! کیا سینے کے اندر ایک حساس اور دردمند دل رکھنا کوئی جرم ہے جس کی سزا ہولناک مصائب کی شکل میں دی جاتی ہے؟ یا دل کا ذکی الحس ہونا بذاتِ خود کوئی ایسی چیز ہے جو آفات و آلام کو دعوت دیتی ہو؟ بارالٰہا! میری زندگی یونہی کیا کم متالم اور مصیبت ناک تھی کہ اُس میں ان بھیانک غموں کا اضافہ ضروری خیال کیا گیا؟ تیری حکمت کس قدر ناقابلِ فہم ہے۔ میرے معبود!"

اُس زمانے میں اگر کوئی چیز اُس کو خودکشی کے اقدام سے باز رکھ سکی تو وہ دو سال کی معصوم بچی تھی جو گویا اس دنیا میں آنکھیں کھولتے ہی آنکھوں سے محروم ہوگئی تھی، جو اپنے سفر کی پہلی منزل ہی میں اپنا زادِ راہ کھو بیٹھی تھی۔ وہ اپنے اردگرد کی تاریکی میں ملفوف، خاموش اور حیران بیٹھی رہا کرتی، اور نظر کی بجائے (کہ وہ اُس کے پاس نہ تھی) اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس تاریکی کو چیرنے کی کوشش کیا کرتی۔ اس کا بدنصیب باپ جب اُسے اس حالت میں دیکھتا تو اُس کا جی چاہتا کہ خود بھی اپنی آنکھیں پھوڑ لے۔ "میرے اللہ!" وہ خدا سے فریاد کرتا، "یہ تو دوہری سزا ہے اور

دوہرا عذاب ہے! اگر تیرے کرم بے نہایت سے میں بھی اندھا ہو جاتا تو کم از کم اِن آنکھوں سے اِس بچی کی تکلیف کو تو نہ دیکھ سکتا!" پھر وہ محبت کے ایک بے اختیار جذبے سے مغلوب ہو کر لڑکی کو گود میں اُٹھا لیتا، بھینچ بھینچ کر اُس کو پیار کرتا، اور بالکل بے ضرورت اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگتا۔ جیسی کہ عام طور پر بچوں کے ساتھ کی جاتی ہیں۔

اِس طرح اُس کی محبت بچی کے ساتھ شدید سے شدید تر ہوتی گئی اور بہت جلد دیوانگی کی حد کو پہنچ گئی۔ اُس کا جذبۂ دل سوزی و ہمدردی جو کُل انسانیت کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے تھا اب صرف ایک بچی کے لئے وقف ہو کر رہ گیا۔ عالمِ انسانی سمٹ کر ایک ننھا سا وجود بن گیا، اور اُس ننھے سے وجود نے اُس کی بیکراں محبت پر قبضہ کر لیا۔ اب وہ اکثر اپنے دل میں سوچتا، "یوں تو دنیا میں شاید ہی کوئی بدبخت باپ ہو جو اپنی اولاد کے ساتھ محبت نہ رکھتا ہو، لیکن کیا کوئی ایسا باپ بھی ہوگا جو اپنی بیٹی سے اِس حد تک محبت کرتا ہو جس حد تک کہ میں کرتا ہوں؟ یہ بے اندازہ اور بے پایاں محبت جو میرے دل میں انیس کے لئے ہے قدرت کا ایک عطیہ ہے، اور قدرت کا یہ عطیہ یقیناً ایسے والدین کو بہت کم ارزانی ہوتا ہے جن کی بیٹیاں میری بیٹی کی طرح بے بصر نہیں ہوتیں۔ لاریب قدرت نے میرے حالِ زار پر ترس کھایا، اور میرے ناقابلِ تلافی نقصان کی تلافی کر دی۔"

تھوڑی سی مدت میں اُس کا انداز نظر کچھ سے کچھ ہو گیا۔ اُس کے ذہنی افق پر ایک نئی روشنی نمودار ہوئی۔ یاس کی گہرائیوں سے سکون و اطمینان کا چشمہ پھوٹا، قنوطیت کے بطن سے رجائیت نے جنم لیا، اور نامرادی کی انتہا سے مراد مندی کا آغاز ہوا۔ وہ دنیا کے سارے غموں کو بھلا کر بیٹی کی محبت میں سرشار ہو گیا اور اِس محبت کی بنیادوں پر

تصورات کے محل اور ارمانوں کی جنتیں تعمیر کرنے لگا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا، "یہ بچی گو بے بصر ہے پھر بھی میری روح کا اجالا ہے۔ یہ میری زندگی کی تاریکیوں میں ماہتاب کی ضیا بن کر آئی ہے۔ مَیں اُس کو اپنے سینے سے لگا کر رکھوں گا! میں اس کی قدر کروں گا! میری دولت جو اب تک بے مصرف رہی ہے اس کے لئے راحت اور آرام مہیا کرے گی۔ یہ اچھے سے اچھا کھائے گی، عمدہ سے عمدہ پہنے گی۔ خادمائیں ہر وقت اس کے حکم کی منتظر رہا کریں گی، اور اس طرح خدمت بجالائیں گی کہ اس کو اپنی بے بصری کا ذرا بھی احساس نہ ہوگا۔ اس کی دنیا بے شک تاریک ہے، لیکن مَیں اس تاریکی کو اپنی تابناک محبت کے ذریعے روشنی اور نور میں تبدیل کر دوں گا۔"

اور دراصل اُس نے ایسا ہی کیا۔ لڑکی کی محبت اور خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ اُس کی زندگی جو مقصد سے خالی ہونے کے باعث بے لطف اور بے کیف تھی، لطفِ مقصد اور کیفِ مدعا سے لبریز ہو گئی۔ اُس کے ارمانوں کی دنیا جو ایک بے آب و گیاہ میدان کی طرح ویران، اُجاڑ اور سنسان تھی، ایک ہرے بھرے باغ کی مانند جگمگا اٹھی۔ اُس کے دل میں جو خلا تھا وہ پُر ہو گیا! وہ دنیا کے غموں کو بھول گیا اور انسانیت کے آلام سے غافل ہو گیا۔

اس طرح اس کی زندگی کے بارہ سال گزر گئے۔

اور اب کہ وہ تینتیس ۳۳ سال کی عمر کو پہنچ چکا ہے، اُس کی زندگی پھر کروٹ بدل رہی ہے۔ اُس کی حیاتِ معنوی میں ایک نئے انقلاب کے آثار دکھائی دیتے ہیں۔ انیس جوانی کی حدود میں داخل ہو چکی ہے۔ اب وہ دس بارہ سال پہلے کی ننھی بچی نہیں ہے جو اپنے ہاتھوں سے راستہ ٹٹولتی ہوئی آتی تھی اور "ابا ابا" کہتی ہوئی باپ کی گود میں چڑھ

جاتی تھی۔ جوان ہونے کے ساتھ اُس میں ایک حجاب اور نسوانی حیا کا ایک احساس پیدا ہوگیا ہے۔ اب وہ باپ سے بات کرتے ہوئے بھی شرماتی ہے۔ بلکہ اُس کے سامنے بھی نہیں آتی اور ہمیشہ دور دور رہتی ہے۔

اور باپ یہ سمجھتا ہے کہ اُس کی دنیا پھر اجڑ رہی ہے، اور اُس کی تعمیر کی ہوئی جنت جہنم بداماں ہوتی جارہی ہے۔ وہ حسرت کے ساتھ اُن دنوں کو یاد کرتا ہے جب اُس کی پیاری بیٹی اُس کی گردن میں باہیں ڈال کر گھنٹوں میٹھی میٹھی باتیں کیا کرتی تھی۔

"اباّجی!" وہ کہا کرتی۔

"ہاں بیٹی!" وہ جواب دیتا۔

"ابّا!"

"ہاں بیٹی، کہو کیا بات ہے؟ انیس!" اور وہ محبت سے اُس کے گالوں پر ہاتھ پھیرتا۔

اور وہ کچھ کہے بغیر اپنا سر اُس کے کندھے پر رکھ دیتی اور اُس کے سینے سے چمٹ جاتی۔

وہ اُس کو اپنی آغوش میں کھینچ لیتا اور خوب پیار کرتا۔

پھر جب وہ ذرا اور بڑی ہو گئی تو خوب کھُل کر باتیں کرنے لگی۔ وہ اُسے اپنی گود میں اُٹھا لیتا اور کہتا، "آہا! آج تو انیس نے نئے کپڑے پہنے ہیں۔ کیسی اچھی معلوم ہو رہی ہے ہماری بیٹی!"

اور انیس اپنا ہاتھ اپنے ریشمی کپڑوں پر پھیرنے لگتی، اور ایک مسرت بھری مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں سے پھُوٹ کر سارے چہرے پر پھیل جاتی۔

پھر وہ اس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہتا، "ہماری بیٹی کتنی خوبصورت ہے! اور بیٹی کے ماتھے پر ایک تل ہے۔"

"ابّا! کس جگہ ہے میرا تل؟" وہ سوال کرتی۔

وہ اپنی انگلی اُس کے تل پر رکھتا۔ ٹھیک اُس جگہ جہاں ہندو سہاگنیں صندل کا ٹیکا لگاتی ہیں۔ اور کہتا، "اس جگہ ہے۔ یہ ہے تمہارا تل۔"

اور پھر وہ بھی اپنی انگلی اُسی جگہ رکھتی اور لمس کے ذریعے تل کو دیکھنے کی کوشش کرتی۔

"اچھا بتاؤ، ہمارے چہرے پر تل کس جگہ ہے،" وہ اس سے کہتا۔

"میں نے تو آپ کا چہرہ دیکھا ہی نہیں ابّا جی،" وہ جواب دیتی۔

"نہیں بیٹی، تم نے میرا چہرہ دیکھا ہے۔ تم بھول گئی ہو۔ جب تم چھوٹی سی تھیں، ننھی سی، منّی سی، تو تم نے مجھے دیکھا تھا — ہاں — تم مجھے دُور سے پہچان لیتی تھیں اور جب میں بازار سے آتا تھا تو تم فوراً ابّا ابّا کہتی ہوئی میری طرف دوڑتی تھیں —"

وہ یہ سن کر خاموش ہو جاتی، اور ایک معصوم سنجیدگی کے ساتھ کچھ سوچنے لگتی۔ گویا اُس بے خبری کے زمانے کو یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہے — گویا ایک خواب دیکھ رہی ہے۔ باپ اُس کی پیشانی چوم لیتا اور اُس کا خواب ختم ہو جاتا۔

مگر یہ سب باتیں اب قصۂ ماضی بن چکی ہیں اور صرف اُن کی ایک تکلیف دہ یاد اُس کے دل میں باقی رہ گئی ہے۔

صرف یہی نہیں کہ اب لڑکی اس سے دور دور رہنے لگی ہے، بلکہ اس دوری اور علیحدگی میں وہ اداس بھی رہتی ہے۔ اور یہ چیز اُس کے باپ کے لئے سب سے زیادہ اذیت کا باعث ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ وہ کسی گوشے میں خاموش بیٹھی ہوئی ہے، اس طرح

کہ اُس کا چہرہ اُداس ہے اور پیشانی پر غمناک تصورات کے نقوش ہیں، تو اس کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے اور دل پر چھُریاں سی چلنے لگتی ہیں۔

"یہ کیا سوچ رہی ہے ؟" وہ اپنے دل میں کہتا ہے، "میری بد قسمت بچی! یہ کن خیالات میں ڈوبی ہوئی ہے میرے معبود ؟ شاید اب اس کو باپ کی محبت کی ضرورت نہیں، شوہر کی محبت کی ضرورت ہے۔ میرے اللہ! ......"

وہ محسوس کرتا ہے کہ اب اس سے زیادہ اپنے آپ کو فریب دینا ناممکن ہے یہ دنیا ایک غم کدہ ہے، اور زندگی ایک مصیبت ناک حادثے کے سوا اور کچھ نہیں۔ اُس کی قنوطیت پھر اُس پر اپنا تسلط جما رہی ہے۔

وہ رات کو سینما دیکھ کر آتا ہے تو حسرت کے ساتھ سوچتا ہے کہ کاش اس دنیا میں کوئی سبیل ہوتی جس سے کھوئی ہوئی آنکھیں واپس آجایا کرتیں۔

اور کبھی کبھی وہ خودکشی کے مسئلے پر بھی غور کیا کرتا ہے۔

بد قسمت باپ اور ناکام فلسفی!
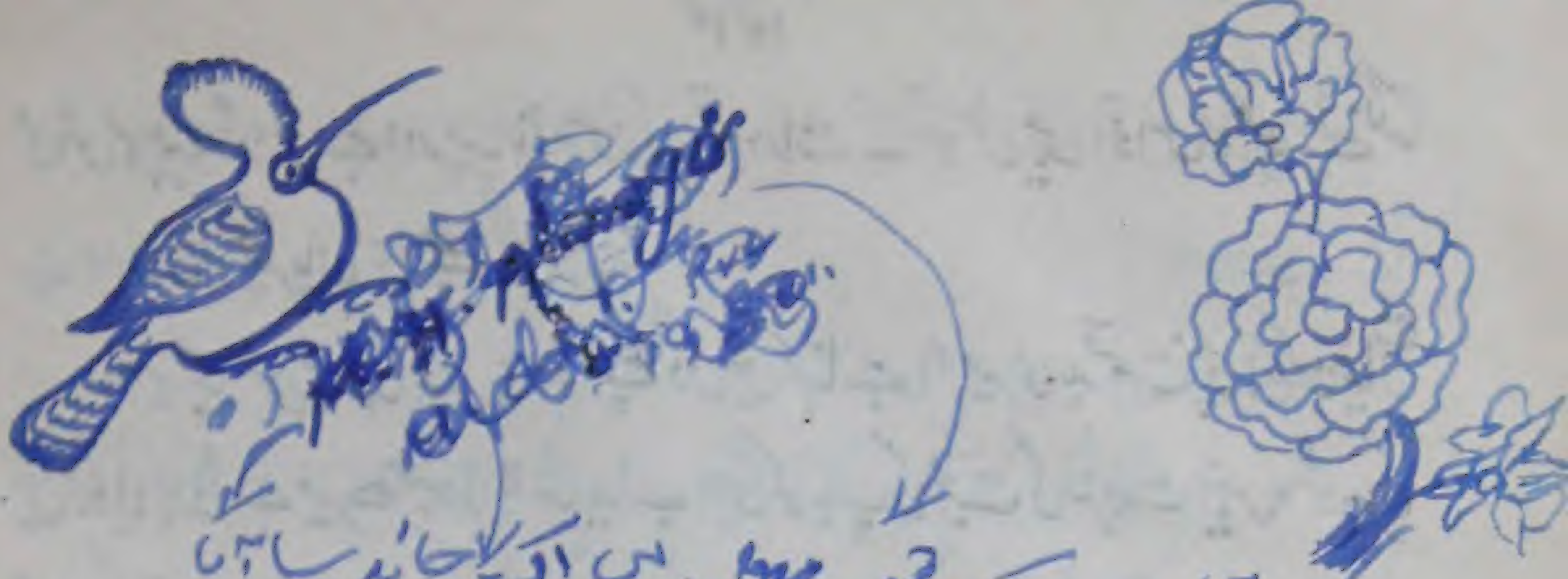
بھول

(۱۹۴۰ء)

اُس نے کتاب ہاتھ سے رکھی اور مونڈھے پر بیٹھے بیٹھے زور سے انگڑائی لی۔ جب انگڑائی لینے کے بعد جسم اپنی اصلی حالت پر آگیا تو ہاتھ بڑھا کر چارپائی پر سے گھڑی اٹھائی اور وقت دیکھا۔ گھڑی میں ڈیڑھ بجا تھا، حالانکہ شام ہو چکی تھی اور سامنے سورج غروب ہو رہا تھا۔ وہ گھڑی کو اپنے کان کے پاس لے گیا۔ ٹِک ٹِک کی آواز بند تھی۔ اُس نے گھڑی کو انگلیوں میں دبا کر ہلایا اور دس پانچ جھٹکے دیئے۔ سیکنڈ کی سوئی کو غور سے دیکھا، لیکن وہ اپنی جگہ پر قائم تھی۔ ایک دفعہ پھر زور سے ہلایا، اور جھٹکے دیئے اور کان کے پاس لے گیا۔ وہ اب بھی خاموش تھی۔ اُس کے چہرے پر تلخی اور جھنجھلاہٹ کی ایک کیفیت پیدا ہوئی جس کا اظہار اگر الفاظ میں کیا جاتا تو یوں ہوتا: ـــــ ”بند ہو گئی کم بخت! لعنت ہو اِس پر!“

اُس نے ناخن سے گھڑی کو کھولا۔ جامد و ساکت پرزوں کو لمحہ بھر دیکھتا رہا۔ پھر انگلی سے بال کمانی کو ہلایا۔ پرزوں نے تھوڑی دیر تک جنبش کی اور پھر بے جان ہو کر رک گئے۔ اب

جو کیفیت اُس کے چہرے پر ظاہر ہوئی اُس کا مطلب یہ تھا: ——— "نامراد! ملعون! جی چاہتا ہے تجھے زمین پر زور سے پٹخ دوں اور جوتے سے رگڑ کر پیس ڈالوں۔" لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ ڈھکنے کو بند کر کے گھڑی کو بے پروائی کے ساتھ چارپائی پر ڈال دیا۔

اس پر افسردگی طاری ہو گئی۔ ایسی افسردگی جو کسی بڑے نقصان یا کسی شدید محرومی کے احساس سے پیدا ہوتی ہے۔ "ابھی دو مہینے ہوئے اُس کی صفائی کرائی تھی،" اُس نے اپنے دل میں کہا، "اور بارہ آنے خرچ کئے تھے۔ معلوم نہیں حرام زادہ صفائی کرتا بھی ہے یا نہیں۔ گذشتہ دو تین سال میں کتنی دفعہ صفائی کرا چکا ہوں! اب اُس کے پاس لے جاؤں گا تو دھڑ سے کہہ دے گا، یہ گھڑی میلی ہو گئی ہے صاحب! صفائی چاہتی ہے۔ تیری ایسی کی تیسی! بدمعاش کہیں کا! بے ایمانی کے سوا کچھ آتا ہی نہیں۔ گھڑی نہ ہوئی ایک عذاب ہو گیا۔ ایک سہ ماہی ٹیکس! وہ میونسپلٹی کا بل آیا ہوا پڑا ہے۔ ہاؤس ٹیکس ادا کرنا ہے۔ یہ ٹیکس ہمیں ترکے میں ملا ہے۔ خوب چیز تھے ہمارے والد صاحب بھی! نہ چھوڑ مرے لاکھ دو لاکھ روپیہ ہمارے لئے جو آج ہم چین کی بنسی بجاتے اور نوکری کے جھنجھٹوں سے آزاد ہوتے۔ چھوڑ کر مرے بھی تو کیا چیز؟ گیارہ روپے سالانہ کا ٹیکس! سال بہ سال ادا کئے جاؤ۔ ارے یار کیوں ناشکری کرتا ہے؟ اتنا بڑا مکان رہنے کو ملا ہوا ہے۔ بالکل مفت میں! اور ٹیکس کا رونا روتا ہے۔ چھی! کیا مکان ہے! کھنڈر اور ویرانے سے بدتر۔ اس کو مکان کہتے ہیں؟ یہ تو تکیہ ہے، فقیر کا تکیہ! سادھوؤں کا استھان! دھونی رمائے پڑے رہو۔ گرتی ہوئی دیواروں کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا کرو۔ اور ٹیکس ادا کئے جاؤ۔ کیا تھی آخری تاریخ اُس کی ادائی کی؟ تاریخ تو کبھی کی نکل چکی ہوگی۔ آج تک کبھی تاریخ پر ادا ہی نہیں ہوا۔ جب قرقی کا وارنٹ آتا ہے تو ادا ہوتا ہے۔ اب کے بھی یہی ہوگا۔ قرقی کا وارنٹ آئے گا تو بھاگا بھاگا پھروں

گا۔ آخر کہاں سے لاؤں گا، گیارہ بارہ روپے ؟"

اُس نے سراسیمہ ہو کر چاروں طرف ایک نظر ڈالی۔ سامنے چارپائی پر گھڑی پڑی ہوئی تھی۔" لعنت ہے اس گھڑی پر! پھر لے جاؤں گا گھڑی ساز کے پاس اور بارہ آنے اُس کی نذر کردوں گا۔ کیسی ناکارہ گھڑی ہے کم بخت! سولہ روپے کی خریدی اور دو تین برس میں کتنے ہی روپے اُوپر سے کھا گئی۔ کیا فائدہ ایسی گھڑی رکھنے سے ؟ اصل میں بڑی چوک ہوئی تم سے۔ وہ والد کی جیبی گھڑی تم کو اپنے ہی پاس رکھنی چاہیئے تھی۔ کیا ہرج تھا اگر وہ جیبی تھی ؟ تم زنجیر نہ ڈالتے۔ یونہی جیب میں پڑا رہا کرتی۔ اور آج کل تو بہت سے لوگ رسٹ واچ کو بھی جیب میں ہی رکھا کرتے ہیں۔ کلائی پر باندھنے کا فیشن تو کچھ پرانا سا ہو گیا مگر تم نے تو جیبی گھڑی کا استعمال فیشن کے خلاف سمجھا اور اتنی لاجواب گھڑی اٹھا کر اُس گدھے کو دیدی۔ ایسے نالائق بھائی بھی کس کام کے! جی چاہتا ہے پکڑ کے کھال اُدھیڑ دوں۔ مارتے مارتے اَدھ مؤا کر دوں! معلوم نہیں بازار میں جاکر بیچ آیا یا سچ مچ چوری ہو گئی! اگر مجھے یہ خبر ہوتی کہ اس کا یہ حشر ہونے والا ہے تو کم بخت کو بیچ ڈالتا۔ ڈیڑھ سو روپے کی چیز تھی۔ کچھ نہ ملنے پر بھی ستر، اسّی روپے مل جاتے۔ اتنی بڑی رقم سے میرے کتنے کام نکلتے! برسوں سے ایک بائیسکل خریدنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ بائیسکل ہی خرید لیتا۔ یہ جو صبح و شام سڑکوں پر گھسٹتا پھرتا ہوں اس سے تو نجات ملتی۔ معلوم نہیں کس مردُود نے چرائی! اگر پتہ لگ جائے تو سوئر کے بچے کو قید کرائے بغیر نہ چھوڑوں۔ مگر یار تم تو اس فلسفے کے قائل ہو کہ آدمی بھوک سے تنگ آکر اور ضرورت سے مجبور ہو کر چوری کرتا ہے۔ اگر سب کی ضرورتیں حسبِ دلخواہ پوری ہوتی رہیں اور سماج مفلسوں اور ناداروں کے وجود سے پاک ہو تو چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں بھی نہ ہوں۔ لوگ بے ایمانی اور دغابازی

اسی لئے کرتے ہیں کہ اس کے سوا کچھ اور کر نہیں سکتے۔ پھر جب تمھاری چیز چوری ہوتی ہے تو کیوں بھناتے ہو، اور کیوں دانت پیس پیس کر چور کو گالیاں دیتے ہو؟ کسی ضرورتمند نے ہی تمھاری گھڑی چرائی ہوگی۔ نہیں جی یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ ہمارا فلسفہ اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہے اور اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ اچکے اور اٹھائی گیرے ہماری چیزیں چرائے جایا کریں اور ہماری پیشانی پر بل نہ پڑے۔ آخر کیوں نہ افسوس ہو ہمیں اتنی عمدہ گھڑی کے چوری ہو جانے کا؟ اور سارا قصور تو اس نامعقول ظفر کا ہے جو انتہا سے زیادہ بے پروا واقع ہوا ہے۔ سارے دن واہی تباہی مارا پھرتا ہے۔ نہ لکھنے پڑھنے کا ہوش ہے نہ اپنے مستقبل کا فکر! آخر کیا کریں گے یہ دنیا میں؟ ہائی اسکول ہی پاس نہیں ہوتا۔ دو سال سے فیل ہو رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہم نے بھی کبھی محنت کے ساتھ نہیں پڑھا۔ مگر ہماری بات دوسری تھی۔ والد زندہ تھے اور مال و دولت کی فراوانی تھی۔ ہر طرح کا عیش و آرام مہیا تھا۔ نہ کسی چیز کی کمی تھی نہ کسی بات کا غم! اگر ہم نے تعلیم پر پوری توجہ صرف نہیں کی تو وہ ایک قدرتی بات تھی۔ مگر اِن کے حالات تو بہت مختلف ہیں۔ اِن کو تو زیادہ ہوشمندی کا ثبوت دینا چاہیئے۔ اور پھر دو دو سال فیل ہونے کے کیا معنی؟ ہم تو کبھی فیل نہیں ہوئے۔ چوتھی جماعت میں جو داخل ہوئے تو آخر تک پاس ہوتے ہی چلے گئے۔ بیس سال کی عمر میں بی، اے کر لیا۔ اور اگر وہ دو سال بیماری میں ضائع نہ ہوتے تو اٹھارہ سال کی عمر ہی میں بی، اے کر لیتے۔ بی۔ اے! بی، اے! بی، اے! کیا فضول رٹ لگا رکھی ہے؟ کون سا تیر مارا ہے تم نے بی۔ اے پاس کر کے؟ اڑتیس روپے پانچ آنے تنخواہ ملتی ہے۔ اگر کل نکال دئے جاؤ تو بھوکے مرو۔ نہ مزدوری کر سکو نہ بھیک مانگ سکو۔ خودکشی کرتے ہی بن پڑے۔ تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں

نے توبی، اے پاس کیا نا؟ کاش والد ایک دو سال اور زندہ رہتے اور میں اُن کے سامنے بی اے کر لیتا! اس ساری تباہی اور بربادی سے بچ جاتا۔ نہ فلم جرنلزم کے چکر میں پڑتا، نہ بمبئی جا کر اپنا وقت اور روپیہ برباد کرتا۔ نہ وہ اخبار نکالنے کی حماقت سرزد ہوتی، نہ دوستوں کو اس طرح لوٹ مار کرنے کا موقع ملتا۔ بس بی۔ اے کرتے ہی وہ کوئی اچھی سی ملازمت دلوا دیتے۔ پنجاب میں نائب تحصیلدار کرا دینا اُن کے لئے کوئی بات ہی نہ تھی۔ آج مزے سے کہیں تحصیلدار یا ڈپٹی کلکٹر ہوتے۔ بلکہ نائب تحصیلداری تو ہائی اسکول کے بعد ہی مل رہی تھی۔ لیکن والد صاحب نے کہا، ابھی یہ لڑکا بہت نو عمر ہے، اس کو پڑھنے دیجئے۔ اور ایک نائب تحصیلداری پر ہی کیا موقوف ہے، وہ چاہتے تو گورنمنٹ آف انڈیا میں کوئی عمدہ سی آسامی دلوا دیتے۔ آج کچھ نہیں تو چار سو پانچ سو روپے تنخواہ ہوتی اور ٹھاٹھ کے ساتھ نئی دہلی کے کسی بنگلے میں براج رہے ہوتے۔ نہ یہ تنگدستی ہوتی، نہ یہ مصیبتیں اور نہ یہ ذلتیں! البتہ ایک بات ہے۔ مجھے زندگی کی ٹھوکروں میں تجربات کے خزانے بھی بہت ملے۔ زمانے کی حقیقت آشکارا ہو گئی۔ یہ معلوم ہوا کہ دنیا میں کتنا ظلم ہے، کتنی بے انصافی ہے، کس قدر خود غرضی اور مکاری ہے، اور انسانیت کے بدن کو کیسی کیسی بیماریاں گھن کی طرح کھا رہی ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان بیماریوں کی جڑ اور اصل بنیاد معلوم ہوئی۔ زندگی کا ایک روشن دہکتا ہوا فلسفہ ہاتھ لگا، جو دنیا کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن کی طرح دمکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اگر بی۔ اے کرنے کے بعد میں کسی اعلیٰ عہدے پر مامور ہو جاتا تو یہ باتیں کہاں سے آتیں؟ اس میں شک نہیں جو مصیبتیں اٹھائیں اور اٹھا رہا ہوں اُن سے بچ جاتا اور ہر طرح کا آرام و اطمینان میسر ہوتا، لیکن وہ زندگی کس قدر مصنوعی ہوتی! اوسط طبقے کی خود غرضانہ زندگی! اوسط طبقے کے نحار و خیالات!

صدیوں کی دماغی غلامی کا بوجھ! آج کم از کم اتنا تو ہے کہ تاریکی اور جہالت کے اُس بوجھ سے میرا دماغ آزاد ہے۔ مگر دوست! یہ روشن خیالی کس کام کی؟ محض خیالات سے کام نہیں بنتا۔ ہو تو تم بھی اُسی مشین کا ایک پرزہ جو تمھارے نزدیک ایک شکنجے سے کم نہیں سماج کی بیڑیاں تو تمھارے پاؤں میں بھی پڑی ہوئی ہیں۔ ہاں سچ ہے۔ مگر میں اِن بیڑیوں کو کیسے توڑ سکتا ہوں؟ یہ ظفر! یہ شفقت! یہ احتل! اور یہ رضیہ! یہ بے ماں باپ کے بچے!"

اُس کے خیالات رُک گئے۔ سات سال پہلے کا ایک منظر متحرک اور ناطق تصاویر کی طرح اُس کی نظروں کے سامنے آگیا:۔

"میرے لال!"

"ہاں اماں!"

"میرے بچے!"

"کہیئے اماں"

"بیٹا! تم شادی کر لینا۔ تمھارا جی بہلے گا۔"

"ہاں اماں۔ آپ خاموش رہیے۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے بات کرنے کو۔"

"تمھارے باپ تو اُٹھ گئے"، اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں، "اب تمھارا اس دنیا میں کون ہے!"

"اماں!" وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر نہیں کہہ سکتا۔

"اور بیٹا! اِن بچوں کو آپا کے سپرد کر دینا۔ اپنی خالہ کے پاس رہیں گے۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔

"آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہو جائے گی۔ روئیے نہیں!" وہ بہ مشکل آنسو ضبط کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"رضیہ اتنی چھوٹی ہے۔ اُس کو کون پالے گا" یہ کہہ کر وہ اور بھی زیادہ رونے لگتی ہے۔

. . . .

. . . .

وہ اِس سات سال پُرانے منظر کو دیکھ کر تڑپ اُٹھا۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں میں تیرنے لگیں۔ منظر دھندلا ہو گیا اور آہستہ آہستہ ماضی کی تاریکیوں میں ڈوب گیا۔ اُس کے خیالات کا چشمہ پھر بہہ نکلا۔

"رضیہ بہت چھوٹی ہے۔ اور اب وہ دس سال کی ہو گئی ہے۔ اُس کو اسکول میں داخل کرانا ہوگا۔ آج کل لڑکیوں کو تعلیم دلانا کتنا ضروری ہے! اور نہ دلانا کتنا بڑا ظلم ہے! مَیں اُس کو ہائی اسکول تک پڑھاؤں گا، بلکہ اِس سے بھی زیادہ۔ وہ لکھنے پڑھنے کی کتنی شوقین ہے! لڑکیاں عام طور پر سبھی ایسی ہوتی ہیں۔ بدشوق تو لڑکے ہی ہوتے ہیں۔ ظفر! اتنا نالائق بھی کوئی گیا ہوگا! ہوش ہی نہیں کسی بات کا۔ کچھ سوچتے سمجھتے ہی نہیں۔ دماغ سے کام نہ لینے کی قسم کھا رکھی ہے۔ ارے کبھی! کبھی تو غور کر لیا کرو اپنی حالت پر! اتنی بھی بے حسی کس کام کی! اُنھیں کی خاطر آج میں اڑتیس روپے پانچ آنے کی نوکری کرنے پر مجبور ہوں۔ مَیں نے اپنی آزادی کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ کیسی مصیبت ہے! لوگ مر جاتے ہیں اور دوسروں کے لئے عذاب چھوڑ جاتے ہیں۔ آخر کیا حق ہے آپ کو بچے پیدا کرنے کا، اگر آپ اُن کی مناسب تربیت اور پرورش کا انتظام نہیں کر سکتے؟ افسر مال تھے صاحب! بارہ سو روپے تنخواہ پاتے

تھے! اور بچے؟ بچے سوکھی روٹیاں کھا کر گزارا کرتے ہیں! لعنت ہے تمھارے اوپر!
مگر یار موت کی کس کو خبر ہوتی ہے؟ اگر کوئی چوالیس سال کی عمر میں ناگہاں مر جائے اور
اپنی اولاد کو بے آسرا چھوڑ جائے تو اُس کو الزام دینا کہاں تک درست ہے؟ اُس کا
اس میں کیا قصور ہے؟ پھر کس کا قصور ہے؟ قصور کسی کا ہو، یہ بات ہے نہایت
خوفناک کہ والدین کے مرنے کے بعد بچوں کی اس حد تک بربادی کا امکان ہے۔ اور
مجھے بھی تو موت آسکتی ہے۔ مَیں بھی تو مرگ ناگہاں کا شکار ہو سکتا ہوں۔ اگر آج مَیں
نہ رہوں تو کیا یہ بچے در در بھیک نہ مانگتے پھریں؟ کیا رضیہ یتیم خانے میں داخل نہ
کرا دی جائے؟ یا کسی امیر گھرانے میں جھاڑو دینے اور برتن مانجھنے پر نوکر نہ رکھ لی جائے؟
یہ کم بخت ظفر! یہ تو کسی مصرف کا بھی نہیں ہے۔ بالکل ہی نکما ہے۔ جی چاہتا ہے ایک
دن ایسی ٹھکائی کروں کہ عمر بھر یاد کرے۔ مگر بچوں کو مارنا کیسی وحشیانہ حرکت ہے!
میں نے آج تک اِن بچّوں کو نہیں مارا۔ والدین کو مرے ہوئے سات آٹھ سال ہو گئے۔
اس مدت میں مَیں نے کبھی اِن پر ہاتھ نہیں اُٹھایا۔ درندے ہیں وہ لوگ جو بچّوں کو
مارتے ہیں۔ والد صاحب!...."

اُس کے حافظے نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ اپنے پوشیدہ خزانے سے
ایک ہولناک منظر نکال کر پیش کیا:۔

وہ دروازے کے باہر کھڑا ہے اور خوف کے مارے تھر تھر کانپ رہا ہے۔
دُبلا پتلا مَنحنی سا لڑکا! باپ ڈیوڑھی میں ہے اور ہاتھ میں ایک بید لئے
ہوئے ہے۔

"اِدھر آ!" باپ چیخ کر کہتا ہے۔

اُس کے بدن میں جیسے جان ہی نہیں ہے۔ آگے بڑھنے کے لئے پاؤں اٹھتے ہی نہیں۔

"چلاتیں!" باپ پھر چیختا ہے۔

وہ چیونٹی کی چال سے آگے کو سرکتا ہے۔ گویا ایک ملزم ہے جو پھانسی پر ٹلکایا جانے والا ہے۔

"کدھر گیا تھا؟"

اور قبل اس کے کہ وہ کوئی جواب دے، بید جنبش میں آجاتا ہے، اور اُس کے جسم پر ضربوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

"آدمی تھوڑی تھا جانور تھا" اُس نے اپنے دل میں کہا۔" اور آپ ماشاءاللہ تعلیم یافتہ تھے! مہذب تھے! اور ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے! اچھی! میرے نزدیک تو نرے جاہل تھے گھامڑ اور جنگلی! مر گئے مردود، فاتحہ نہ درود! کر گئے ہمارا ستیاناس! آج مجھ میں جتنی کمزوریاں پائی جاتی ہیں سب بچپن کی انھیں مصیبتوں کا نتیجہ ہیں۔ آئے دن کی جسمانی سزا، ہر وقت کی گھڑکیاں اور ڈانٹ ڈپٹ، چوبیس گھنٹے ایک خوف میں مبتلا رہنا — یہی وہ چیزیں ہیں جو ایک بچے کے ذہن کو مفلوج کر دیتی ہیں۔ اُس میں ایک شدید قسم کا احساسِ کمتری پیدا ہو جاتا ہے۔ آج میں اپنے اندر خود اعتمادی کا شائبہ بھی نہیں پاتا۔ میرا دماغ آزادی کے ساتھ سوچنے کے قابل نہیں ہے۔ میں جو کچھ سوچتا ہوں اُس کو ضبطِ تحریر میں لانے کی جراُت نہیں رکھتا۔ اگر کبھی کچھ لکھتا بھی ہوں تو اُسے دوسروں کو دکھاتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ بڑے لوگوں سے ملنے میں مجھے ایک جھجک محسوس ہوتی ہے، یہ جانتے

ہوئے کہ بڑے لوگ بھی بالکل معمولی انسان ہوتے ہیں۔ یہ ساری کمزوریاں اُن سختیوں کا نتیجہ ہیں جو میں نے بچپن میں باپ کے ہاتھوں برداشت کیں۔ انھیں کمزوریوں کی بدولت میری زندگی برباد ہوئی ہے۔ یہ کمزوریاں مجھ میں نہ ہوتیں تو آج میں ایک بہتر انسان ہوتا اور ہرگز اپنی ذہانت کو اڑتیس روپے پانچ آنے پر فروخت نہ کرتا۔"

اُسے یک لخت اپنے اردگرد کی بڑھتی ہوئی تاریکی کا احساس ہوا۔ اُس نے ہتھیلیوں سے آنکھوں کو مَلا، جن میں تخیلات کا خمار بھرا ہوا تھا اور جو اندھیرے میں مسلسل گھورتے رہنے کے باعث پتھرا سی گئی تھیں۔ پھر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

چارپائی پر گھڑی پڑی ہوئی تھی۔ اُس کو اُٹھایا۔ ہاتھ خود بخود چابی پر گیا۔ چابی گھومنے لگی۔ وہ گھڑی کو جلدی سے کان کے پاس لے گیا۔ اُس میں سے ٹِک ٹِک کی آواز آرہی تھی۔

گویا بات صرف اس قدر تھی کہ وہ گھڑی میں چابی دینا بھول گیا تھا۔

وہ بے اختیار مسکرا پڑا۔ معلوم نہیں یہ مسکراہٹ اُس دلچسپ بھول پر ایک لطیف طنز تھی یا بارہ آنے کی بچت پر دلی مسرّت کا اظہار!

زینت
(۱۹۴۰ء)

محبت ایک فریب ہے۔ رنگین، پرکیف اور دلآویز!
ہم محبت کرتے ہیں تو کس کس طرح اپنے آپ کو دہوکا دیتے ہیں! تخیلات کے محل بناتے ہیں۔ تصورات کی جنتیں تعمیر کرتے ہیں۔ ایک نئی دنیا بساتے ہیں، ایسی دنیا جو حقیقت اور واقعیت سے دُور ہوتی ہے۔ ہماری اصلی زندگی کے مکروہات اور معمولات سے بہت پرے! ایسی دنیا جس میں غم روزگار کی کثافتیں بار نہیں پاتیں، جہاں محبت اور محبت کی حلاوتوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

گرمیوں کی ایک سہ پہر ہے۔ گرم، سنسان اور طویل! وقت ہے کہ کاٹے نہیں کٹتا۔ چاء پی رہا ہوں اور رومال سے پسینہ خشک کرتا جاتا ہوں۔ کسی فلمی گانے کا ایک بول زبان پر ہے۔ دھیمے دھیمے سروں میں الاپ رہا ہوں۔ یکایک کمرے کا دروازہ کھُلتا

ہے، اور نعیم صاحب مسکراتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔
یہ میرے نئے دوست ہیں۔ پڑوس میں جو ڈاکٹر صاحب رہتے ہیں اُن کے چھوٹے بھائی! علی گڑھ میں قانون پڑھتے ہیں اور آج کل گرمیوں کی تعطیل میں گھر آئے ہوئے ہیں۔
"آئیے نعیم صاحب! تشریف لائیے ـــــ چائے پیجئے ـــــ ارے غیاث! ایک پیالی اور لاؤ۔"
"جی نہیں، میں چائے نہیں پیوں گا،" نعیم صاحب کہتے ہیں، "میں تو آپ کا گانا سننے کی غرض سے آیا ہوں۔"
"گانا؟ میں گانا کب جانتا ہوں؟" میں حیرت کے ساتھ سوال کرتا ہوں۔
"اور یہ ابھی کون گا رہا تھا؟ میں بہت دیر سے آپ کے گانے کی آواز سُن رہا تھا۔ آپ تو اکثر گایا کرتے ہیں۔"
"آپ اِس کو گانا کہتے ہیں؟" میں ہنس کر جواب دیتا ہوں، "مجھے تو صرف گنگنانا آتا ہے۔ ایک عادت سی ہو گئی ہے۔ ہر وقت گنگنایا کرتا ہوں۔"
"خیر وہ گانا ہو یا گنگنانا، آواز آپ کی بہت خوب ہے،" نعیم صاحب کہتے ہیں۔
میں اُن کی تعریف کو نظر انداز کرتے ہوئے جواب دیتا ہوں، "اصل میں مجھے تنہائی بہت ستاتی ہے۔ اور تنہائی کا علاج میرے پاس اِس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ سگریٹ پیتا رہوں یا گنگناتا رہوں۔"
نعیم صاحب کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں، اور وہ زیادہ بیدار اور مستعد ہو کر فرماتے ہیں، "تنہائی کا جو اصلی علاج ہے وہ آپ کیوں نہیں کرتے؟"
"وہ کیا؟"

"شادی!" وہ یوں مسکرا کر کہتے ہیں گویا کوئی بہت ہی شوخی آمیز بات کہہ رہے ہوں،
"تنہائی کی مصیبت سے بچنے کا بہترین ذریعہ ہے شادی!"

میں بھی اس طرح مسکراتا ہوں گویا اُن کی بات سُن کر بہت محظوظ ہوا ہوں۔

"ہاں، بات تو صحیح ہے" میں جواب دیتا ہوں، "مگر میں فی الحال شادی نہیں کرسکتا۔"

"کیوں؟ کیا تامل ہے؟"

"تامل یہی ہے کہ میں ابھی روزگار کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ میری پریکٹس ابھی ایسی نہیں ہے کہ......"

نعیم صاحب زور سے ہنستے ہیں "جہاں تک میں نے دیکھا ہے۔ وکیل لوگ اپنی آمدنی بڑھا چڑھا کر بتایا کرتے ہیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے آپ کی روش بالکل اس کے برعکس ہے۔ آپ......"

"نہیں، یہ بات ہرگز نہیں" میں جواب دیتا ہوں "میری آمدنی فی الحقیقت اتنی معمولی ہے کہ خود میرے اخراجات کے لئے یہ مشکل کافی ہوتی ہے"

نعیم صاحب پھر ہنستے ہیں، اور کہتے ہیں، "یہ محض آپ کا خیال ہے وکیل صاحب! آپ کی پریکٹس بہت اچھی ہے اور آپ یقیناً ایک بیوی کا بار اُٹھا سکتے ہیں۔"

"بار تو بے شک اُٹھا سکتا ہوں۔ اور بار جب پڑتا ہے اُٹھایا ہی جاتا ہے۔ مگر میرا مطلب یہ ہے کہ...... یعنی...... ازدواجی زندگی کا جو معیار میرے ذہن میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں اُس کے مطابق میں زندگی بسر نہ کرسکوں گا۔"

"تو اس کے معنی ہیں کہ آپ نے ازدواجی زندگی کا جو معیار قائم کیا ہے وہ بہت ہی بلند ہے۔"

"ممکن ہے بلند ہو ــــ ضرورت سے زیادہ بلند! مگر فی الحال میں شادی کے مسئلے پر اسی طرح غور کیا کرتا ہوں۔"

شام کا وقت ہے۔ میں اپنے پڑوسی ڈاکٹر صاحب سے بحیثیت ایک پڑوسی کے ملنے آیا ہوں۔ پُر تکلف ڈرائنگ روم ہے، ڈاکٹر صاحب ہیں، اُن کے چھوٹے بھائی نعیم ہیں، اور میں ہوں۔ ریڈیو کی دلنواز موسیقی کمرے میں گونج رہی ہے ــــ دہلی سے مس چیٹرجی کا گانا نشر ہو رہا ہے۔

تھوڑی دیر میں گانا ختم ہوتا ہے، اور اعلان کیا جاتا ہے، "۔۔۔۔ اب مسز رؤف علی تقریر فرمائیں گی۔ تقریر کا موضوع ہے ــــ ہندوستانی سماج میں عورت کا درجہ!"

اعلان سنتے ہی ڈاکٹر صاحب اپنے بھائی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، "نعیم! ذرا زینت کو بلا لو۔ وہ یہ تقریر سننا چاہتی تھی۔"

نعیم صاحب میری طرف دیکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اُن کا مطلب سمجھ جاتے ہیں اور فرماتے ہیں، "کیا ہرج ہے، وکیل صاحب تو اپنے ہی آدمی ہیں۔"

نعیم صاحب اُٹھ کر اندر چلے جاتے ہیں۔ اب ڈاکٹر صاحب مجھ سے مخاطب ہوتے ہیں۔ "یہ پردہ بھی کیسی مہمل چیز ہے۔ لاحول ولا قوۃ!"

میں خاموش رہتا ہوں اور کوئی جواب نہیں دیتا۔ مسز رؤف علی اپنی تقریر شروع کر چکی ہیں۔ اُدھر کان لگا دیتا ہوں۔

ایک لمحے کے بعد نعیم صاحب واپس آ کر اپنی کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں اور مجھے احساس ہوتا ہے کہ اُن کے پیچھے پیچھے کوئی اور بھی آیا ہے۔ ایک اُچٹتی ہوئی اور بے پروا نظر زینت پر

ڈالتا ہوں، یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ کسی عورت کا کمرے میں اچانک آجانا میرے لئے سراسیگی کا باعث نہیں ہوتا، اور یہ کہ زینت سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے، نہ ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد تقریر سننے میں محو ہو جاتا ہوں، یعنی یہ ظاہر کرتا ہوں کہ تقریر سننے میں محو ہوں۔ جب مسٹر روف علی کوئی پتے کی بات کہتی ہیں تو مسکرا کر ڈاکٹر صاحب یا نعیم صاحب کی طرف دیکھتا ہوں۔ زینت کی طرف بالکل نہیں دیکھتا، گویا اُس کی موجودگی سے قطعی بے خبر ہوں مگر یہ سب دکھاوا ہی دکھاوا ہے۔ اصل یہ ہے کہ ایک پیکرِ ناز و زیبائی کے قرب کا احساس جیسا کچھ ایک نوجوان کے دل میں ہونا چاہئے میرے دل میں بھی ہے۔ مجھے اس وقت دنیا ایک حسین تر اور رنگین تر جگہ معلوم ہو رہی ہے۔ روح کی گہرائیوں میں کوئی چیز کروٹ لے کر بیدار ہو رہی ہے۔ کان اگرچہ مسز روف علی کی آواز پر لگے ہوئے ہیں، لیکن ذہن اُن کے بیشتر الفاظ کو معنی کا جامہ پہنانے سے انکار کر رہا ہے۔ وہ یہ بتا رہی ہیں کہ ہندوستانی سماج میں عورت کا کیا درجہ ہے۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میرے دل میں عورت کی کتنی محبت ہے اور ہو سکتی ہے۔

تقریر ختم ہو جاتی ہے۔

"اچھی تقریر ہے" ڈاکٹر صاحب تبصرہ فرماتے ہیں۔

"کہو زینت! تمھاری کیا رائے ہے؟" ڈاکٹر صاحب اپنی لڑکی سے پوچھتے ہیں۔

وہ جواب میں صرف نظریں جھکا کر مسکراتی ہے۔ لیکن مجھے اُس پر ایک بھرپور نظر ڈالنے کا موقع مل جاتا ہے، اور میں اس موقع سے فائدہ اٹھاتا ہوں۔ ایک ہی نظر میں اُس کے حسن کی تمام رنگینیوں کو سمیٹ لیتا ہوں، اور پھر کمال بے نیازی سے سگریٹ سلگانے میں مصروف ہو جاتا ہوں۔

مسٹر رؤف علی کی تقریر کے بعد موسیقی کا پروگرام پھر شروع ہو گیا ہے۔ کوئی پیشہ ور مغنّی اپنے فن کے اظہار میں گلے کا سارا زور صرف کر رہا ہے۔ ہم، یعنی ڈاکٹر صاحب، نعیم صاحب اور مَیں، متفقہ طور پر یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ریڈیو بند کر دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ کمرے میں یک لخت سکون ہو جاتا ہے، ایسا سکون جو اکثر ریلوے اسٹیشن پر گاڑی گذر جانے کے بعد محسوس ہوتا ہے۔

"اچھا بیٹی! تو تم اب جاؤ،" ڈاکٹر صاحب زینت سے کہتے ہیں۔

وہ خاموشی سے اٹھ کر چلی جاتی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کمرے میں شام ہو گئی۔

آج مَیں ڈاکٹر صاحب کے یہاں کھانے پر مدعو ہوں۔

ڈاکٹر صاحب ایک تیسرے شخص کے ذریعے مجھے اپنی فرزندی میں لینے کی خواہش ظاہر کر چکے ہیں۔ مَیں نے اپنی رضامندی ظاہر نہیں کی ہے، لیکن کوئی مایوس کُن جواب بھی نہیں دیا ہے۔ میں آج کل اس مسئلے پر غور کر رہا ہوں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب مجھے محظوظ کرنے اور اپنی محبت و شفقت جتانے کے لئے ہر ممکن ذریعے سے کام لے رہے ہیں۔ آج کا ڈنر بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کھانے کی میز پر ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب کی بیگم، اور نعیم صاحب کے علاوہ زینت بھی موجود ہے۔ وہ میرے سامنے ہی بیٹھی ہے۔ اُس کی نظریں اس طرح جھکی ہوئی ہیں گویا اُس نے مجھے دیکھنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ میں بھی اُس کو بے باکانہ دیکھنے سے اجتناب کر رہا ہوں۔ مگر موقع پاتا ہوں تو دیکھ ہی لیتا ہوں۔

اپنی نظریں اس کے چہرے پر جما دیتا ہوں۔ وہ میری گرمیٔ نگاہ کو محسوس کرتی ہے اور اُس کے حسن میں شرمگینی کی ایک اور جھلک پیدا ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی چھوٹی بچی کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ سب بیک وقت اُس سے مخاطب ہو جاتے ہیں۔ اور طرح طرح کے سوالات کرنے لگتے ہیں۔

"اب تک تم کہاں تھیں شوکت ؟"

"تم نے کھانا کھا لیا بیٹی ؟"

"اور کھاؤ گی ؟"

"یہ پھل رکھے ہیں، لو گی ؟"

میں یہ دیکھ کر کہ سب کی توجہ شوکت کی طرف ہے، خود زینت کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔ بریانی کی ایک قاب میز کے بیچ میں، میرے اور اُس کے درمیان رکھی ہوئی ہے وہ اس میں سے بریانی لے رہی ہے۔ میں قاب کو اپنی طرف گھسیٹ لیتا ہوں، اور چمچہ اُس کے ہاتھ میں رہ جاتا ہے۔ شرم کی سُرخی سے اُس کا چہرہ گلاب کا پھول بن جاتا ہے۔

"ذرا وہ چمچہ دیجیئے" میں سنجیدہ منہ بنا کر اُس سے کہتا ہوں۔

وہ ایک دلفریب ادا کے ساتھ چمچہ میری جانب بڑھا دیتی ہے۔

"آپ نے یہ نہیں لیا" ڈاکٹر صاحب ایک مخصوص کھانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہتے ہیں "یہ زینت کا تیار کیا ہوا ہے۔ اِن کے سوا ہمارے ہاں اس چیز کو اور کوئی نہیں پکا سکتا۔"

"اچھا! بہت خوب!" میں جواب دیتا ہوں "تو اِن کو وقت مل جاتا ہے اِن

کاموں کے لئے بھی ؟"

"ہاں ہاں کیوں نہیں!" ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں، "لکھنے پڑھنے سے جو وقت بچتا ہے وہ انھیں کاموں میں صرف ہوتا ہے۔ مَیں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں وکیل صاحب جو اپنی لڑکیوں کو گھر کے کام کاج سے بالکل بے بہرہ رکھتے ہیں۔ لطف تو جبھی ہے کہ لڑکی تعلیم بھی حاصل کرے اور گھر کے کام میں بھی ماہر ہو۔ اب یہ زینت ہیں! ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتی ہیں اور کھانے پکانے، سینے پرونے میں بھی کسی سے کم نہیں ...."

ڈاکٹر صاحب کی بیگم اپنے شوہر کی بات کاٹ دیتی ہیں، اور زینت کے خانگی کمالات پر روشنی ڈالنے لگتی ہیں۔ نعیم صاحب حتی الامکان اُن کی مدد کرتے ہیں۔ جب یہ دونوں بول چکتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب دوبارہ اپنے خیالات کا اظہار شروع کرتے ہیں۔ غرض کہ زینت کی خوبیوں کا بیان مسلسل جاری رہتا ہے۔

مَیں سب کچھ سنتا ہوں اور تحسین آمیز نظروں سے بار بار زینت کو دیکھتا ہوں۔ اُس کی صندلی باہوں کا حسن میری نظروں میں کھبا جا رہا ہے۔

"اچھا یہ تو بتاؤ تم نے آپا سے وہ بات کہہ دی تھی؟" میں شوکت سے سوال کرتا ہوں۔

وہ مسکراتی ہے اور سر کی جنبش سے اثبات میں جواب دیتی ہے۔

"کیا کہا تھا؟"

وہ خاموش رہتی ہے اور شرما کر سر جھکا لیتی ہے۔

میں ایک ہاتھ اُس کے شانے پر رکھتا ہوں، اور دوسرے ہاتھ سے ٹھوڑی پکڑ کر اُس کا چہرہ اُوپر اٹھاتا ہوں۔ "بتاؤ شوکت! کیا کہا تھا تم نے اپنی آپا سے؟"

"ہم نے کہا تھا......" وہ پھر شرما کر رہ جاتی ہے۔

"ہاں کیا کہا تھا؟"

"ہم نے کہا تھا کہ وکیل صاحب نے کہا ہے کہ ہم تمھیں پڑھانے آجایا کریں۔"

"تم نے کہا تھا یہی؟" میں شوق بھرے لہجے میں اُس سے پوچھتا ہوں۔

"ہاں" وہ جواب دیتی ہے۔

"سچ کہتی ہو؟"

"ہاں" وہ پھر جواب دیتی ہے۔

"اچھا پھر کیا کہا تمھاری آپا نے یہ سن کر؟"

"کچھ نہیں۔"

"کچھ تو کہا ہی ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں کہا۔"

"تو اس کے معنی یہ ہیں تم نے ہماری بات کہی ہی نہیں اپنی آپا سے۔"

"کہی تو تھی" وہ قدرے برہم ہو کر جواب دیتی ہے۔

میں فرط خوشی سے اُس کو گود میں اُٹھا لیتا ہوں اور اُس کی پیشانی چومتا ہوں۔

برسات کے موسم کی ایک شام ہے، اور میری ازدواجی زندگی کی صبح!

ہم دونوں ــــ میں اور زینت ــــ زندگی کی ایک نئی شاہراہ پر گامزن ہو رہے ہیں۔ ہمارے سفر کی ابتدا ریل کے سفر سے ہوتی ہے۔ ہم اپنا ماہِ عسل گزارنے کے لئے پہاڑ پر جا رہے ہیں۔

انجن سیٹی دیتا ہے۔ گاڑی چھوٹتی ہے، اور آن کی آن میں اسٹیشن سے نکل جاتی ہے۔ رومال ہلا ہلا کر الوداع کہنے والے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔

ریل کا ڈبہ ہے، زینت ہے اور میں ہوں۔

اس وقت میری ساری زندگی سمٹ کر زینت میں مرکوز ہو گئی ہے۔ میں اُس کے برابر بیٹھ جاتا ہوں، اور اُس کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر باتوں کا سلسلہ شروع کرتا ہوں جو سفر کے آخر تک قائم رہتا ہے۔

ہم نینی تال کی سرد اور پُرسکون بلندیوں پر مقیم ہیں۔

مجھے یہ اطلاع ملتی ہے کہ میرا پرانا دوست اور کالج کا ساتھی زبیر بھی آج کل یہیں ہے۔ میں اُس سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کرتا ہوں۔

ایک دن فون پر اُس سے گفتگو ہوتی ہے۔ وہ نینی تال میں میری موجودگی کی خبر سُن کر خوش ہوتا ہے اور کہتا ہے "مجھ سے فوراً آ کر ملو، یا اپنا پتہ بتاؤ تاکہ میں آسکوں۔"

میں جواب دیتا ہوں، "نہیں، میں خود تم سے آج سہ پہر کو ملوں گا اور تمھارے ساتھ چائے پیوں گا۔ اور ہاں ـــــ ایک بات اور ہے، میری بیوی بھی میرے ساتھ ہوں گی۔"

"اچھا!" زبیر چلا اٹھتا ہے، "یہ کب سے؟ گویا چپ چاپ شادی کر لی اور ہمیں خبر بھی نہ کی۔"

"اب یہ سب باتیں ملاقات کے وقت ہوں گی" میں جواب دیتا ہوں۔

"اچھی بات ہے۔ تو آج چار بجے آؤ۔ میں انتظار کروں گا۔"

"ہاں، شام کو چار بجے،" میں یہ کہکر فون ہاتھ سے رکھ دیتا ہوں۔
سہ پہر کے قریب ہم زبیر سے ملنے کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ میں دل ہی دل میں یہ سوچ کر خوش ہو رہا ہوں کہ زبیر میری بیوی کو دیکھ کر کس قدر مرعوب ہوگا۔ وہ تو شاید یہ سمجھ رہا ہوگا کہ اس کی بیوی ہوگی کوئی برقع میں لپٹی لپٹائی عورت جو ایک گٹھڑی کی طرح لڑھکتی پھڑکتی، میری طرف دیکھے بغیر گھر میں گھس جائے گی اور بیگم صاحبہ کے پاس جا بیٹھے گی۔ مگر بچا کے ہوش ٹھکانے آجائیں گے جب وہ دیکھیں گے کہ یہ تو ایک تعلیم یافتہ عورت ہے ـــــ بیسویں صدی کی ایک مہذب خاتون!
ہم زبیر کے مکان پر پہنچتے ہیں۔ وہ زینت کو دیکھ کر واقعی گھبرا سا جاتا ہے۔ یقیناً وہ ایسی ملاقات کے لئے تیار نہ تھا۔
"میری شریکِ حیات زینت!" میں زبیر سے اپنی بیوی کا تعارف کراتا ہوں۔
وہ بدحواس ہو جاتا ہے۔ میں اُس کی سراسیمگی سے بے انتہا لطف حاصل کرتا ہوں۔
بارے وہ اپنے آپ کو سنبھالتا ہے، اور دو چار لفظوں میں اپنی مسرت کا رسمی اظہار کرتا ہے۔ اس کے بعد ہم اُس کے ـــــ سجے سجائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہیں اور بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنے لگتے ہیں۔

یہ وہ خواب ہیں جو میں شب و روز دیکھا کرتا ہوں ـــــ جی ہاں، یہ سب خواب ہیں!
اور حقیقت ـــــ؟
حقیقت صرف اس قدر ہے کہ میں نے زینت کو ـــــ یعنی اُس لڑکی کو جس کا نام

میں نے زینت رکھ دیا ہے ـــــ دو تین مرتبہ موٹر سے اترتے یا موٹر پر سوار ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔

اُف جوانی کی خود فریبیاں اور محبت کی فریب کاریاں!

مذاق
(۱۹۴۰ء)

یہ سب ایک مذاق تھا۔ لیکن کتنا قیامت خیز اور کتنا خوفناک!

مَیں ایک شام کیفے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس زمانے میں میرے پاس وقت گزارنے کی یہی ایک صورت تھی۔ کیونکہ زندگی ہر نوع کے افکار و مشاغل سے آزاد تھی ہنگاموں سے خالی! غم سے مبرّا! پُرسکون و مطمئن!

چائے مع تمام لوازمات کے سامنے رکھی ہوئی تھی۔ لیکن پینے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ چائے بھی کوئی کہاں تک پی سکتا ہے! ہاتھ میں ایک نئی خریدی ہوئی کتاب تھی اور میں لایعنی طور پر اُس کے اوراق کو اُلٹ پلٹ کر رہا تھا۔

صدیق ایک گرجتے ہوئے طوفان کی مانند کیفے میں داخل ہوا۔ زور زور سے زمین پر قدم رکھتا ہوا اور ہاتھوں کو دو لاٹھیوں کی طرح فضا میں لہراتا ہوا! جیسے کوئی باولا یا آسیب زدہ خبطی۔ وہ یونیورسٹی کا طالب علم تھا اور میرا بے تکلف دوست۔

اُس نے مجھے دیکھتے ہی ایک بے ہنگم قہقہہ لگایا۔

"آپ ڈٹے ہوئے ہیں حسبِ معمول! جیتے رہو میرے شیر!" یہ کہہ کر وہ بیٹھ گیا اور چائے بنانے لگا۔

"اماں تمھیں کوئی کام نہیں ہے؟ جب دیکھو کیفے میں؟ جب دیکھو کیفے میں! آخر کیا قصہ ہے یہ؟"

"کام؟" میں نے کہا، "مجھ جیسے نوجوان وکیل کے پاس بھی کوئی کام ہو سکتا ہے؟"

"اور جب تم جیسے نوجوان وکیل کا باپ ڈسٹرکٹ جج ہو تو صبح سے شام تک، چائے پینے کے سوا اور کیا کام رہ جاتا ہے! کیوں؟"

میں ہنسنے لگا۔

"بھئی بات اصل یہ ہے" میں نے اسے بتایا، "کہ مئی میں والد کی چھٹی ختم ہو رہی ہے اور وہ لکھنو آ رہے ہیں۔ میں بھی لکھنو منتقل ہو جاؤں گا اور وہیں پریکٹس شروع کرونگا۔ دو چار مہینے یہاں اور رہوں۔۔۔۔"

"تو اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"اس سے یہ ہوتا ہے کہ بس اب اکٹھا لکھنو میں کام کروں گا۔ جب یہاں سے جانا ہی ہے تو یہاں کام کرنے سے کیا فائدہ؟"

"بہت خوب! اچھی منطق ہے ــــ غرضکہ مئی تک آپ بالکل خالی ہیں اور دن دن بھر کیفے میں بیٹھا رہا کریں گے۔"

"کیفے میں بیٹھوں یا نہ بیٹھوں، بہرحال مئی تک بالکل خالی ہوں۔"

"مزے ہیں بھائی تمھارے۔ کئے جاؤ عیش ــــ ایک ہم ہیں۔ کولھو کے بیل کی

طرح ہر وقت جُتے رہتے ہیں۔ ایک چھوڑ دو دو ٹیوشنیں ہیں۔ سارے دن بھاگے بھاگے پھرتے ہیں۔"

"دو ٹیوشنیں کس طرح ہیں ؟"

"ایک تو وہی پرانی رام نگر ہاوس والی ٹیوشن ہے۔ اور اب اسکول میں ایک لڑکے کو پڑھانے جاتا ہوں۔"

"اچھا! اس لڑکی کو ابھی تک پڑھا رہے ہو ؟"

"ہاں کیوں نہیں، وہ تو ہماری مستقل ٹیوشن ہے۔"

"بڑے خوش قسمت ہو یار !"

"خوش قسمت !"

"ہاں اور کیا۔ ایک لڑکی کو پڑھانے سے زیادہ دلچسپ مشغلہ اور کیا ہو سکتا ہے !"

"رہنے دے یار ـــــ" اُس کے ہونٹوں پر طنز کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"کیوں ؟ کیا میں غلط کہتا ہوں ؟" میں نے پوچھا۔

"میاں تم اس چکر میں نہیں پڑے ہو۔ سمجھے ؟ ساری دلچسپی دھری رہ جاتی ہے جب آدمی کو دو دو گھنٹے "کُتّے" کی طرح بھونکنا پڑتا ہے ـــــ یہ رومان نہیں ہے بھائی صاحب! اس کا نام مزدوری ہے ! مزدوری !"

"ایک آدھ ٹیوشن مجھے بھی دلوا دو نا" میں نے اُس کی تلخ گفتگو کو روکنے کے لئے کہا۔

"جی بہت کی آپ نے ٹیوشن !

"معاوضہ کچھ نہیں لوں گا، اور پردے کے پیچھے بیٹھ کر پڑھا دیا کروں گا" میں نے مسکراتے

ہوئے کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔

اس گفتگو کے تین چار دن بعد کا ذکر ہے کہ صدیق مجھ سے کوٹھی پر ملنے آیا۔ میں شام کے کھانے سے فارغ ہو کر چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا۔ اتفاق سے اُس وقت یونیورسٹی کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ طلبہ کے سیاسی رجحانات زیر بحث تھے۔

"آؤ صدیق! بیٹھو۔ تمھارے ہی مذاق کی گفتگو ہو رہی ہے۔" میں نے اُس سے کہا۔

"بھئی میں بیٹھوں گا نہیں۔ معاف کرنا۔ مجھے فوراً ہوسٹل پہنچنا ہے۔ ورنہ کھانا نہیں ملے گا۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔"

"وہ کیا؟"

"ذرا ایک منٹ کے لئے اِدھر آجاؤ۔ صرف ایک منٹ کے لئے!" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر جانے کے لئے مُڑا۔

میں اپنے مہمانوں سے اجازت لیکر اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

باہر پہنچ کر پہلے تو وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسا۔ پھر بولا "ارے بھئی! ـــ وہ ـــ تم ٹیوشن کرنا چاہتے تھے نا ـــ اُس کا انتظام ہو گیا ہے۔"

پہلے تو میں اس بات کا مطلب نہیں سمجھا، لیکن پھر فوراً ہی وہ کیفے والی گفتگو یاد آگئی اور میں بے اختیار ہنس پڑا۔

"ہنسی کی بات نہیں ہے۔" اُس نے کہا، "میں معاملہ طے کر آیا ہوں۔"

"معاملہ طے کر آیا ہوں!" میں نے ہنستے ہوئے اُس کے الفاظ کو دہرایا۔

"واقعی مذاق کی بات نہیں ہے ــــ دیکھو اب پیچھے نہ ہٹنا، ورنہ مجھے بڑی شرمندگی اٹھانی پڑے گی ــــ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔"

"اوہو!" میں مصنوعی انداز میں اچھل پڑا۔ "اچھا تو کہاں معاملہ طے کرکے آئے ہو؟"

وہ میرے اس فقرے پر قدرے مسکرایا اور پھر بولا، "وہ حسین ہے نا ۔ حسین الدین! تم تو جانتے ہو اُس کو! وہی جو تین سال سے بی، اے میں فیل ہو رہا ہے ۔۔۔"

"جس کے ساتھ تم اُس دن سینما جا رہے تھے؟"

"ہاں وہی۔ اُس کی بہن اس سال ہائی اسکول کا امتحان دے رہی ہے۔ وہ انگریزی میں ذرا کمزور ہے۔ اُس کو انگریزی پڑھانی ہوگی۔"

"مگر ۔۔۔۔۔"

"مگر وگر کچھ نہیں۔ اب تو تمھیں پڑھانا ہی ہوگا۔ قصہ یہ ہے کہ اس روز تم سے کیفے میں باتیں ہو ئی تھیں نا؟ اتفاق سے اُسی دن رات کو حسین سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگا، میری بہن ہائی اسکول کے امتحان میں بیٹھ رہی ہے۔ اُس کو تین چار مہینے قبل اسی لئے گھر سے بُلا لیا تھا کہ یہاں تیاری اچھی ہو جائے گی۔ لیکن ایک مہینہ ہونے کو آیا، ابھی تک کوئی مناسب ٹیوٹر ہی نہیں ملا ہے۔ بڑی پریشانی ہے۔ میں کسی یونیورسٹی سٹوڈنٹ سے پڑھوانا نہیں چاہتا اور اسکول کے ٹیچر چالیس پچاس سے کم پر راضی نہیں ہوتے۔ اُس نے یہ کہا تو مجھے فوراً تمھاری بات یاد آ گئی۔ میں نے کہا، میرے ایک دوست ہیں۔ وکیل! مئی میں وہ یہاں سے جا رہے ہیں۔ اور اُس وقت تک بالکل خالی ہیں۔ میں اُن سے کہوں گا وہ پڑھا دیں گے۔ کہنے لگا، لیں گے کیا؟ میں نے کہا، کچھ بھی نہیں، یونہی پڑھا دیں گے۔ میرے دوست ہیں اور آسودہ حال ہیں۔ انھیں لینے دینے سے کیا واسطہ! ۔۔۔۔۔"

"کیا کہنے ہیں میری آسودہ حالی کے!" میں بیچ میں بول اٹھا۔ "اتنا تو کما نہیں سکتا کہ سگریٹوں کا خرچ نکل آئے۔"

صدیقی نے میری بات کو جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ اپنی داستان سرائی میں مصروف تھا۔ "پھر میں نے حسینہ کو تمہارے متعلق تفصیل کے ساتھ بتایا۔ وہ تم سے واقف ہے۔ میرے ساتھ تمہیں دو ایک دفعہ دیکھ چکا ہے۔ اَب اُس دن سے میرے کمرے کے برابر پھیرے کر رہا ہے مگر مجھے فرصت ہی نہیں ہوئی یہاں آنے کی۔ تم رہتے بھی تو ہو اللہ میاں کے پچھواڑے ...."

"اجی وکیل صاحب!" کمرے میں سے آواز آئی۔ مَیں بھول گیا تھا کہ چند ملاقاتی اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔

"اچھا تو بات پکّی ہے نا؟" صدیقی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر رخصت ہوتے ہوئے کہا۔

"بھئی میں سوچوں گا۔"

"لاحول ولاقوۃ! اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟ اور اب سوچنے کی گنجائش ہی کہاں ہے؟ مَیں اُس سے وعدہ کر چکا ہوں۔"

"مگر بھئی مَیں تو مذاق کر رہا تھا۔"

"ہاں ہاں بابا تم مذاق کر رہے تھے۔ مانا تم مذاق کر رہے تھے۔ مگر اب یہ مذاق نہیں رہا۔ اب تو ...."

"اور میرے پاس وقت ہی کہاں ہے؟"

"جی ہاں،" اُس نے جی کو کھینچ کر کہا۔ "آپ کے پاس بھلا وقت کہاں ہے! دن دن بھر کیسے میں مَیں ہی تو بیٹھا رہتا ہوں!"

مَیں انفعال آمیز ہنسی ہنسنے لگا۔ پھر مَیں نے کہا "لیکن صدیق! یہ روز روز پڑھانے جانا تو بہت تکلیف دہ ثابت ہوگا۔ مَیں اِس مصیبت کو کیسے بھگتوں گا؟"

"روز نہ جا سکو تو نہ سہی۔ ایک دن بیچ کر کے چلے جایا کرنا۔ ہفتے میں تین چار دن پڑھا دینا کافی ہوگا۔"

"یہ ٹھیک ہے" مَیں نے کہا۔

"اچھا خدا حافظ! کل مَیں حسین کو ساتھ لے کر آؤں گا۔ باقی گفتگو اُس کے سامنے ہوگی۔ ابھی وقت بھی تو طے کرنا ہے ــــ خدا حافظ!" یہ کہہ کر وہ اپنی سائیکل پر سوار ہو گیا۔

"اُس کا نام کیا ہے؟ نام تو بتاتے جاؤ!" میں نے پکار کر کہا۔

"مجھے نہیں معلوم" صدیق نے دور سے جواب دیا۔

یوں مَیں عشرت کا ٹیوٹر مقرر ہوا۔ اور یوں وہ ایک بات جو مَیں نے مذاق اور چہل کے طور پر کہی تھی رنگ لائی۔

مَیں نے عشرت کو انگریزی پڑھائی شروع کر دی۔

اب تک مَیں نے صرف پڑھا ہی تھا۔ پڑھانے کی کبھی نوبت نہیں آئی تھی۔ یہ میری زندگی میں اپنی قسم کا پہلا تجربہ تھا، اور جس قدر نیا تھا اُسی قدر پُر لطف بھی! چنانچہ پہلے دن جب مَیں نے عشرت کو اُس کی کتاب کے دو ابتدائی صفحے پڑھائے تو مجھے عجیب و غریب خوشی کا احساس ہوا۔ میں سوچنے لگا کہ کسی کو پڑھانا ــــ اپنے ذہن کا ایک حصہ کسی دوسرے کے ذہن میں منتقل کرنا ــــ کیسا دلفریب مشغلہ ہے! کتنا روح پرور اور کتنا مسرت انگیز! پھر یہی نہیں۔ مجھے اپنی بعض پوشیدہ صلاحیتوں کا بھی احساس ہوا۔ مَیں نے خیال کیا کہ

مَیں انگریزی کتنی اچھی بول سکتا ہوں، کس خوبی کے ساتھ جملوں کی تشریح کر سکتا ہوں، اور پیچیدہ نکات کو حل کرنے کی کتنی عمدہ قابلیت مجھ میں پائی جاتی ہے!

پہلے دن میں عشرت کو پڑھا کر رخصت ہونے لگا تو میری روح وجد کر رہی تھی اور گو میرے قدم زمین پر پڑ رہے تھے، مَیں خود آسمان کی فضاؤں میں پرواز کر رہا تھا۔

صدیق اور حسین نے کہا تھا کہ ہفتے میں تین چار دن پڑھانا کافی ہوگا۔ لیکن میں تقریباً روز آنے جانے لگا۔ میرا ذوق و شوق ترقی کر رہا تھا اور میری دلچسپی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ چند دن کے اندر ہی اندر یہ حالت ہو گئی کہ تمام دوسری مصروفیات سے جی اکتانے لگا، اور عشرت کو پڑھانا زندگی کا دلچسپ ترین مشغلہ اور اصل ترین مقصد معلوم ہونے لگا۔ میں شب کو سات بجے پڑھانے جاتا تھا۔ دن بھر دل کی یہ کیفیت رہتی کہ جیسے مجھے کسی کا انتظار ہے، جیسے کوئی خوبصورت چمکتی ہوئی چیز جس کے تصور سے دماغ کا گوشہ گوشہ جگمگا رہا ہے، مجھے کہیں سے ملنے والی ہے۔ وہ دو گھنٹے جو میں عشرت کو پڑھاتے میں صرف کرتا جنت سے چرائے ہوئے لمحے معلوم ہوتے۔

ایک دن مَیں حسبِ معمول اُس کو انگریزی کی کتاب پڑھا رہا تھا۔ اکبر اعظم کا بیان تھا۔ لکھنے والے نے اکبر کی عظمت پر روشنی ڈالی تھی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی انشا پردازانہ عظمت کو بھی نہیں بھولا تھا۔ مَیں اُس کے بھاری بھرکم پُرمغز جملوں کی تشریح کر رہا تھا لفظوں کے معنی بھی بتاتا جاتا تھا اور عبارت کا مفہوم بھی۔ ایسے موقعوں پر، یعنی جب میں لمبی لمبی تشریحات پیش کیا کرتا، عشرت کتاب کو سامنے میز پر رکھ کر اپنی نظریں میرے چہرے پر

گاڑ دیا کرتی۔ جب تک میں بولتا رہتا وہ نظروں میں نظریں ڈال کر سنتی رہتی اور سر کی خفیف جنبش سے گویا یہ کہتی جاتی، "میں سمجھتی ہوں ———— "میں آپ سے متفق ہوں!" لیکن آج میں اس میں کچھ تبدیلی پا رہا تھا۔ آج اُس کی نظریں کچھ جھکی جھکی سی تھیں۔ اس کی نگاہ میں وہ چند روز قبل والا بے کانہ انداز نہیں تھا۔ چہرے پر ایک حیا افروز منفعلانہ کیفیت چھائی ہوئی تھی۔ میں یہ رنگ دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔ "میرے اللہ! یہ کیا!" میں نے اپنے دل میں کہا، "یہ ایکا ایکی عشرت کو کیا ہو گیا؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ میری آنکھوں نے اپنی خاموش زبان میں اُس سے کچھ کہہ دیا ہو، یا کوئی خوفناک راز اُس تک پہنچا دیا ہو؟ یقیناً ایسا ہی ہے۔ خدا سمجھے ان آنکھوں کو! یہ ہمیشہ اور ہر جگہ مجھے آفت میں مبتلا کر دیا کرتی ہیں۔ لیکن آخر وہ کیا بات ہے جو انھوں نے عشرت سے کہہ دی ہے؟ وہ کونسا راز ہے؟" اس وقت مومن کا یہ شعر خود بخود لوحِ ذہن پر اُبھر آیا:—

دل نے دنیا نئی بنا ڈالی اور ہمیں آج تک خبر نہ ہوئی

اور اب مجھے معلوم ہوا کہ عشرت کو پڑھانے میں جو لطف مجھے حاصل ہو رہا تھا اُس کا سبب صرف یہی نہیں تھا کہ پڑھانا بذاتِ خود ایک دلچسپ مشغلہ ہے، بلکہ یہ بھی کہ میں عشرت جیسی غیرتِ ماہ دوشیزہ کو پڑھا رہا تھا۔ "طاعت" میں "مے و انگبیں کی لاگ" بھی تھی۔

عشرت کی یہ محجوب نگاہی ایک مستقل ادا ثابت ہوئی۔ اب ہمیشہ اُس کی آنکھیں جھکی جھکی رہنے لگیں۔ میں پڑھاتا یا پڑھائی کے سلسلے میں کوئی دوسری بات کہتا تو

وہ نظریں نیچی کئے سُنا کرتی۔ پہلے جب وہ نظروں میں نظریں ڈال کر میرے سامنے بیٹھتی تھی اور پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہتی تھی تو مجھے اُس کی آنکھیں ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے گرمیوں کے موسم میں صبح کے وقت آسمان کی ٹھنڈی اور صاف وشفاف فضا۔ اب اگر اتفاق سے وہ کبھی اپنی نظریں اوپر اُٹھاتی اور لحہ بھر کے لئے مجھے دیکھتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ فضائے آسمانی میں بہار جھوم رہی ہے اور گھٹائیں رقص کر رہی ہیں۔ اُس وقت آنکھوں کے سامنے ایک تجلی سی کوندجاتی اور میں برق زدہ سا ہو کر رہجاتا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بیٹھے بیٹھے عشرت کا دوپٹہ سر سے ڈھلک جاتا اور اُس کے چمکتے ہوئے سیاہ بال بے نقاب ہو جاتے۔ اُس وقت میری نظریں بے اختیار اُس کے چہرے سے ہٹ کر بالوں پر جم جاتیں اور جم کر رہ جاتیں۔ میں بالوں کی چمک اور آرائش دیکھ کر اس درجہ متاثر ہوتا کہ میری گفتگو کی روانی میں فرق آجاتا اور زبان لڑکھڑانے لگتی۔ عشرت اپنے سر کو دوبارہ ڈھانپنے میں عمداً دیر کرتی۔ جب میں اپنے آپ کو سنبھال لیتا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان کو قابو میں لے آتا تو وہ ایک دلفریب ادا کے ساتھ اپنا ہاتھ پشت کی جانب لے جاتی اور دوپٹے کا دامن دوبارہ سر پر ڈال لیتی۔

ایک دن عشرت کچھ تحریری کام کر رہی تھی۔ اور میں بیٹھا خاموشی کے ساتھ سگریٹ پی رہا تھا۔ یکایک میں نے اپنے قدموں میں ایک چوڑی کا ٹکڑا پڑا ہوا دیکھا۔ اُسے دیکھکر مجھے چند ماہ پیشتر کا ایک معمولی سا واقعہ یاد آگیا۔ میں اپنے دو دوستوں کے ساتھ دہلی کی ایک تنگ وتاریک لیکن رومان میں لپٹی ہوئی گلی میں سے گزر رہا تھا۔ زمین پر دو تین

چوڑیوں کے ٹکڑے پڑے ہوئے دکھائی دئے۔ میں نے جھٹ ان کو موتیوں کی طرح چُن لیا اور جھاڑ پونچھ کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اس پر وہ دونوں دوست میرے اوپر خوب ہنسے۔ لیکن میں ایسی چیز کو جس کا تعلق نسائیت اور دوشیزگی سے ہو زمین پر پڑا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ چنانچہ یہاں بھی جب میں نے چوڑی کا ایک ٹکڑا فرش پر پڑا ہوا دیکھا تو جھک کر اُسے اُٹھا لیا۔ اور اپنے سامنے میز پر رکھ لیا۔ پھر قدرتاً میرا ذہن عشرت کے ہاتھوں کی جانب منتقل ہوا۔ اُس کا داہنا ہاتھ جس میں وہ پنسل تھامے ہوئی تھی کھلا ہوا تھا۔ میری نظر فوراً اُس پر پڑی۔ ساتھ ساتھ عشرت نے بھی اُس طرف دیکھا۔ اُس میں شربتی رنگ کی دو لہریے دار چوڑیاں تھیں۔ دوسرا ہاتھ میز پر نہیں تھا اور میں اُس کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن تھوڑے سے توقف کے بعد عشرت نے اس ہاتھ کو بھی دوپٹے سے باہر نکالا اور کاپی پکڑنے کے بہانے سے میز پر رکھ لیا۔ اُس ہاتھ میں صرف ایک چوڑی تھی!

اُس دن جب میں رخصت ہونے لگا تو میں نے میز پر سے اپنے فاؤنٹن پن اور سگریٹ کیس کے ساتھ اُس چوڑی کے ٹکڑے کو بھی اٹھا لیا اور عشرت کے سامنے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ یہ ایک شوخی تھی، مگر آہ! ایسی شوخی جس میں محبت کی ہزاروں مجبوریاں اور لاچاریاں چھپی ہوئی تھیں۔

اگلے دن وہاں پہنچا تو اپنی اس شوخی کو بالکل بھول چکا تھا۔ مگر تھوڑی دیر بعد پڑھاتے پڑھاتے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کانچ کی کوئی چیز پاؤں کے نیچے دب کر ٹوٹ گئی۔ جھک کر دیکھا تو ایک ٹوٹی ہوئی چوڑی قدموں میں پڑی ہوئی نظر آئی۔ نگاہیں دیوانہ وار عشرت کے ہاتھوں کی طرف لپکیں۔ اُس کے دونوں ہاتھوں میں صرف ایک

ایک چوڑی تھی!

اُس وقت میرے دل کی کیا حالت ہوئی، یہ میں نہیں بیان کر سکتا، کسی طرح نہیں بتا سکتا۔ اگر عمر بھر جذبات کی ترجمانی کا فن سیکھتا رہوں تب بھی نہیں بتا سکوں گا۔

ایک دن پڑھانے کے دوران میں میں نے سگریٹ سلگایا، اور ایک لمبا سا کش لے کر سارا دھواں عشرت کی طرف پھینک دیا۔ اگر اس کو میری یہ حرکت پسند نہ آتی تو وہ اپنی پیشانی پر ایک ہلکی سی شکن ڈال کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر سکتی تھی۔ لیکن اُس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ دھوئیں سے قدرے پریشان ضرور ہوئی، مگر اُس کے ساتھ ساتھ ایک نہایت خفیف مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں سے پھوٹ کر سارے چہرے پر دوڑ گئی۔

اس کے بعد میں اکثر یہ شرارت کیا کرتا، اور اُس کو سگریٹ کے دھوئیں میں نہلا دیا کرتا۔ معلوم نہیں اس سے میرا کیا مقصد ہوتا تھا۔ شاید میں اس طرح اس کو اپنے سے قریب تر محسوس کرتا تھا، گویا سگریٹ کا دھواں میرے بازو تھے جو اُس کے گرد حلقہ کر لیتے تھے اور اُس کے حسین چہرے کو اپنی آغوش میں لے لیا کرتے تھے۔ یا غالباً میں یہ سمجھتا تھا کہ میری سگریٹ کا دھواں میری سلگتی ہوئی روح کا پیغام بن کر اُس تک جائے گا اور میری لب نا آشنا محبت کا افسانہ اُس سے کہے گا۔ بہر حال مقصد سے قطع نظر جب کبھی میں ایسا کرتا، وہ بے انتہا حسین معلوم ہوتی، گویا ایک سبک روح پری ہے جو بادلوں میں اُڑی چلی جا رہی ہے!

مارچ کا آغاز تھا۔ مچھروں کی بھنبھناہٹ گرمی کی آمد کا اعلان کر رہی تھی۔ ایک مچھر عشرت کے رخسار پر آکر بیٹھ گیا۔ میں بھلا یہ کیونکر دیکھ سکتا تھا کہ کسی جاندار کا جسم عشرت کے جسم سے مس کرے، اور وہ بھی خون چوسنے کی خاطر! میں نے کہا، "تمھارے چہرے پر مچھر بیٹھا ہے"۔ (رخسار کا لفظ میں استعمال نہ کر سکتا تھا) عشرت نے ہاتھ کی ایک جنبش سے اُسے اڑا دیا۔ اسی طرح ایک دن ایک مچھر اُس کے کھلے ہوئے بازو پر آن بیٹھا۔ میرے ہاتھ میں پنسل تھی۔ میں پنسل کو اس کے قریب لے گیا اور وہ اڑ گیا۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ عشرت میرے لکھائے ہوئے اردو جملوں کا انگریزی میں ترجمہ کر رہی تھی۔ داہنے ہاتھ سے تو ظاہر ہے کہ وہ لکھ رہی تھی اور بائیں ہاتھ سے کاپی کو تھامے ہوئی تھی۔ یہ ہاتھ چونکہ ایک جگہ رکھا ہوا تھا اور جنبش نہیں کر رہا تھا اس لئے اس کی پشت پر ایک مچھر آکر بیٹھ گیا اور اپنا ڈنک چبھو کر خون پینے لگا۔ عشرت نے بجائے اس کے کہ اُس کو اڑا دے یا وہیں کچل ڈالے، نیچی نظروں سے مجھے دیکھا۔ اُس کو مچھر سے چھٹکارا پانے کے لئے میری مدد کی ضرورت تھی، یا شاید وہ مجھے خدمت کا موقع دے رہی تھی۔ مگر میں بڑی مشکل میں تھا۔ نہ تو اس سے یہ کہہ سکتا تھا کہ تمھارے ہاتھ پر مچھر بیٹھا ہوا ہے، اس کو اڑا دو، اور نہ خود اپنا ہاتھ بڑھا کر ایسا کر سکتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اتفاق سے اُس وقت حسین ہمارے برابر بیٹھا ہوا کچھ لکھنے لکھانے کا کام کر رہا تھا۔ لیکن بہرحال مچھر کا عشرت کے ہاتھ پر بیٹھنا میرے لئے قطعی ناقابلِ برداشت تھا۔ اس لئے اور بھی کہ وہ خون پی پی کر موٹا ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنے کوٹ کی اوپر کی جیب میں سے اپنے رومال کو

اس طرح جھٹکا دے کر کھینچا کہ وہ فضا میں لہراتا ہوا عشرت کے ہاتھ کی طرف گیا۔
یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ پھر اڑ گیا۔

غرض اسی طرح شوخیوں، آہوں اور حسرتوں کے درمیان تین مہینے گزر گئے
تین مہینے جو صبحِ بہار کی طرح مختصر بھی تھے اور شبِ فراق کی طرح طویل بھی!
جو میرے لئے سامانِ نشاط بھی لائے اور سامانِ اذیت بھی! میں اکثر اپنے دل
میں سوچا کرتا کہ اللہ! جس دن میں نے مذاق کے طور پر عشرت کو پڑھانے کا
کام اپنے ذمہ لیا تھا، اُس دن مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ آنے والے چند مہینے میری
زندگی کا ایک نیا دور ثابت ہوں گے، اور میرے دل کی سُونی بستی کو بہار
کی مسرت اور خزاں کے خوف سے معمور کر دیں گے۔ پھر مجھے چار سال پہلے کا
زمانہ یاد آ جاتا، وہ زمانہ جب میں نے ایک ماہ پیکر دوشیزہ سے محبت کی، اور
اپنے شباب کی تمام شگفتگی اور سارا والہانہ پن اُس پر نثار کرنے کے بعد بھی
ناکام رہا۔ اس وقت میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ میری پہلی اور آخری محبت ہے، اور آئندہ
میرے دل کے ٹوٹے ہوئے ساز میں کبھی اتنی صلاحیت نہ ہو گی کہ اُس پر محبت کا گیت
گایا جا سکے۔ مگر آہ! مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ قبل از وقت بجھائی ہوئی شمع بہت
جلدی اور تیزی کے ساتھ آگ پکڑتی ہے اور پہلے کی بہ نسبت زیادہ شدت کے
ساتھ جلتی ہے۔ محبت کی چوٹ کھایا ہوا دل مزید زخموں اور نئی نئی جراحتوں کی
تلاش میں رہتا ہے، اور انھیں زخموں اور جراحتوں کو دردِ زندگی کا درماں
سمجھتا ہے۔ چنانچہ وہ زخمی ہوتا ہے، اور زخم مندمل نہیں ہونے پاتا کہ پھر زخمی

ہوتا ہے۔ پھر زخمی ہوتا ہے۔ پھر زخمی ہوتا ہے۔ زندگی ایک رِستا ہوا ناسور بن کر رہ جاتی ہے۔

اس طرح میں دن دن بھر اور رات رات بھر عشق کے فلسفے پر اور اپنی رہینِ محبت زندگی پر غور کرتا۔ اور پھر جب عشرت کو پڑھانے جاتا تو ساری فلسفہ بافی اور خیال آرائی بھول کر اُس کو دیکھنے میں محو ہو جاتا۔ کتاب پڑھاتے وقت تو میرا ذہن بہت مصروف ہوتا تھا، لیکن جب زبانی سبق ختم ہو جاتا اور وہ کچھ لکھنے لکھانے کا کام کرنے لگتی تو مجھے فرصت کے ساتھ اس کو دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ میں اپنی نظریں اس کے چہرے پر گاڑ دیتا اور بے دردی کے ساتھ مسلسل اُس کو دیکھے جاتا۔ وہ اپنی جھکی ہوئی نظروں کے باوجود میرے دیکھنے کو محسوس کر لیتی۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک انتہائی نازک مسکراہٹ کھیلنے لگتی اور چہرے کے شہابی رنگ میں سُرخی کی ایک اور جھلک پیدا ہو جاتی۔ گویا ایک گلاب کا پھول ہے جو سورج کی تیز کرنوں کو برداشت نہیں کر سکتا اور تلملا رہا ہے۔ میں پھر بھی اُسے دیکھے جاتا۔ اس کا شاداب چہرہ، صبیح گردن اور صندلی باہیں دیکھ کر یہ شدید خواہش ——— چڑھے ہوئے دریا کے طوفان کی طرح شدید خواہش ——— میرے دل میں پیدا ہوتی کہ کتاب، کاپی اور پنسل اُس سے چھین لوں، اور اُس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیکر اُس سے کہوں، "عشرت! میری روح! میری زندگی! مجھے تم سے محبت ہے!" لیکن ظاہر ہے کہ میں ایسا نہ کر سکتا تھا۔ مجھے اپنی خواہش کو دبانا پڑتا اور اُس کے دبانے میں ایک غیر معمولی ——— فوق الانسانی ——— قوت سے کام

لینا پڑتا۔ پھر میں اپنے دل میں سوچتا کہ کیا واقعی میری محبت محتاجِ اظہار ہے؟ کیا وہ ظاہر نہیں ہو چکی؟ اور کیا عشرت نے محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا؟ بے شک میری زبان پر کوئی لفظ نہیں آیا، اور عشرت نے بھی اپنی زبان سے کچھ نہ کہا۔ لیکن کیا واقعی ہمارے درمیان کوئی گفتگو نہیں ہوئی؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایک دوسرے سے کچھ نہ کہنے کے باوجود ہم نے پیار اور محبت کی باتیں کی ہیں، عشق کی منزلوں کو دوش بدوش طے کیا ہے، ایک دوسرے کو پہچانا ہے، سمجھا ہے؟ کیا کوئی دوسرا امر دہے جو میری طرح عشرت کے قلب و روح کی گہرائیوں کو سمجھتا ہو، جو اُس سے اس قدر قریب اور اتنا واقف ہو جتنا میں ہوں؟ پھر میں تصور کی آنکھوں سے عشرت کو ایک خوفناک دیو، اُس کے ہونے والے شوہر کی آغوش میں دیکھتا، اور میری حالت اُس شخص کی سی ہو جاتی جو خواب میں ایک ہیبت ناک منظر دیکھ کر چیخنا چاہتا ہوں اور نہ چیخ سکتا ہو۔ اتنے میں عشرت اپنی کاپی میری طرف بڑھا دیتی یا کوئی سوال کر بیٹھتی، اور میں اس ڈراونے خواب سے بیدار ہو جاتا۔

وقتاً فوقتاً صدیق سے بھی ملاقات ہوتی رہتی۔ کبھی وہ باتوں باتوں میں پوچھ بیٹھتا، "کہو بھئی! پڑھائی ہو رہی ہے؟"

"ہاں! ہو تو رہی ہے" میں جواب میں کہتا۔

"کیسا کام ہو رہا ہے؟ پاس ہو جائے گی؟"

"ہاں انگریزی میں تو ہو جائے گی۔ اور مضمونوں کی میں کہتا نہیں ——"

میرے خیال سے نکل ہی جائے گی امتحان میں بڑی ذہین لڑکی ہے؟" میں بے تعلقی کے انداز سے کہتا۔

ایک دن یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ صدیق یکایک بولا، "اب تو تمھیں اس سے اچھی خاصی محبت ہو گئی ہو گی؟"

میرا دل دھک سے ہو گیا۔ میں نے تیزی سے اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں شوخی کی چمک!

"محبت کر کے میں اُس سے کیا لوں گا!" میں نے بے پروائی کے ساتھ کہا۔

وہ ہنس پڑا اور بات ختم ہو گئی۔ مجھے یہ خیال کر کے خوشی ہوئی کہ میں نے اپنے راز کو بہت کامیابی کے ساتھ چھپایا اور چہرے سے کسی کیفیت یا جذبے کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔

صدیق نے یہ بات محض شرارتاً کہی تھی اور وہ حقیقت سے بالکل بے خبر تھا۔ مگر اُس نے لاعلمی میں میری روح کے نازک ترین تار پر انگلی رکھدی تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ میں اُس سے کھُل جاتا اور کہتا، "کم بخت! خدا تجھے غارت کرے! تو نے مجھے بیٹھے بٹھائے کس آفت میں مبتلا کر دیا؟ مذاق ہی مذاق میں دل کا خون ہو گیا!" لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس باب میں اس سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا، اور خاموش رہنے پر مجبور تھا۔ وہ بے شک میرا بے تکلف دوست تھا۔ لیکن حسین سے بھی اس کے روابط بہت گہرے تھے اور یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ میں اُس سے عشرت کے متعلق اپنے جذبات کا ذکر کرتا۔

محبت انسان کی زندگی کا بہت بڑا فریب ہے۔ یہ فریب کتنا ہی دلچسپ کیوں نہو، ہے بہرحال فریب! میں بھی اسی فریب میں مبتلا تھا۔ جانتا تھا کہ عشرت کبھی میری نہیں ہوسکتی، پھر بھی اُس کی محبت میں سرشار تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب میں اس کو انگریزی کا ایک آخری سبق پڑھا کر اُس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاؤں گا، پھر بھی ایک پُر رومان مستقبل کے خواب دیکھ رہا تھا لیکن زمان حقیقت کو تو نہیں جھٹلا سکتا! چنانچہ وہ دن بھی آہی گیا ——— وہ دن جب میں عشرت کو آخری سبق پڑھانے کے لئے گیا۔

کورس تو پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔ میں اُس کو کتاب کے بعض اہم اور مشکل مقامات سمجھاتا رہا۔ کوئی غیر معمولی بات ظہور پذیر نہیں ہوئی، سوائے اس کے کہ دل جدائی کے خیال سے کانپ کانپ اُٹھتا تھا، اور عشرت کی آنکھیں پہلے سے زیادہ جھکی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ جب چلنے کا وقت قریب آیا تو ایک فوری جذبے کے ماتحت میں نے عشرت سے کہا، "ذرا اپنی کاپی دو۔ ترجمے کے لئے جملے لکھدوں"۔ اُس نے اپنی کاپی دیدی اور حسب ذیل جملے بے اختیار میرے قلم سے ٹپک پڑے :۔

میری زندگی ناکامیوں کی ایک مسلسل داستان ہے!

تم نے میری زندگی برباد کردی۔ خدا تمھیں خوش رکھے!

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان اپنی بربادی پر خوش ہوتا ہے!

کاش میری قسمت مجھے یہاں نہ لائی ہوتی!

میں ایک بدقسمت انسان ہوں۔ محرومیوں کے سوا مجھے کبھی کچھ نہ ملا۔

میرا خیال ہے کہ جس وقت میں یہ جملے لکھ رہا تھا، اس وقت یقیناً میرے ذہن

کا پرتو میرے چہرے پر پڑ رہا ہوگا۔ گویا میں ان جملوں کو صرف عشرت کی کاپی پر ہی نہیں، بلکہ اپنے چہرے پر بھی تحریر کر رہا تھا۔ یہ میں اس لئے کہتا ہوں کہ لکھنے کے دوران میں میری نظر عشرت پر پڑی تو میں نے اُس کے چہرے پر حُسن کی ایک نئی بہار دیکھی۔ اُس وقت اس کی حالت بالکل اُس دوشیزہ کی سی تھی جس سے پہلی بار محبت کا اظہار کیا جا رہا ہو۔ رخسار حیا کی سُرخیوں سے گلستان بنے ہوئے تھے، ہونٹوں پر محبت رقص کر رہی تھی اور آنکھوں میں جوانی انگڑائیاں لے رہی تھی۔

لکھ چکا تو کاپی عشرت کی طرف بڑھا دی۔ اُس نے جملوں کو پڑھا اور اتنی تیزی کے ساتھ کہ اُس کی نظر صفحے پر دوڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ پڑھ کر اُس کے چہرے کی کیفیات شدید تر ہو گئیں۔ رخسار دہکتے ہوئے انگارے بن گئے۔ ہونٹوں پر ایک موجِ برق نمایاں ہوئی اور وہیں ساکت ہو کر رہ گئی۔ آنکھیں یک لخت چمکیں اور جھک گئیں گویا ایک بُتکدے کا دروازہ کھلا اور بند ہو گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ اب صورتِ حال میری برداشت سے باہر ہے اور وہ غیر معمولی اور فوق الانسانی قوتِ ضبط جس سے میں اب تک کام لیتا رہا ہوں جواب دے رہی ہے۔ اس لئے میں کُرسی سے اُٹھا اور عشرت پر نظر ڈالے بغیر خدا حافظ کہتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔

یہ آخری سبق تھا جو میں نے عشرت کو پڑھایا۔

امتحان سے لے کر نتیجہ برآمد ہونے تک کا زمانہ ایک طویل دورِ کرب تھا جس کی تفصیل نہ میں پیش کرنا چاہتا ہوں، نہ کر سکتا ہوں

مئی میں نتیجہ شائع ہوا۔ عشرت پاس ہو گئی۔ وہ ابھی وطن واپس نہیں گئی تھی اور

نتیجے کے انتظار میں یونیورسٹی ہی میں ٹھیری ہوئی تھی۔ جس دن نتیجہ ظاہر ہوا اُسی دن دوپہر کو میں مبارکباد دینے اُس کے مکان پر گیا۔ مئی کے مہینے کی ایک دوپہر جیسی کچھ گرم اور شعلہ بار ہوسکتی ہے ویسی ہی وہ دوپہر تھی۔ لیکن یہ جسم کو جلانے والی آگ اُس آگ کے مقابلے میں کچھ بھی نہ تھی جو میرے دل کو آتشکدہ بنائے ہوئے تھی اور روح کو پھونکے ڈالتی تھی۔

مکان پر پہنچ کر اپنی آمد کی اطلاع کرائی۔ حسین دوڑا ہوا باہر آیا۔ وہ معمول سے زیادہ خوش تھا اور اپنی ممنونیت کے اظہار میں مبالغے سے کام لے رہا تھا۔ مجھے گھر کے اندر لے گیا۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اُس کمرے میں داخل ہوا جس میں میں اپنی جوانی دفن کرچکا تھا۔ عشرت گوناگوں جذبات کا مجسمہ بنی ہوئی دروازے کے قریب کھڑی تھی۔

حسین اُسے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ میں نے مسرت ناک لہجے میں کہا "بھئی مبارک ہو! پاس ہوگئیں تم۔"

"یہ آپ کی مہربانی کا نتیجہ ہے" اُس نے جواب دیا۔

پھر میں نے حسین سے کہا، "حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے بہت ہی زیادہ محنت کی تھی۔ یہ واقعی کامیابی کی مستحق تھیں۔"

"اجی نہیں، محنت اس نے خاک نہیں کی" حسین بولا، "بس یونہی اتفاق سے پاس ہوگئی۔"

"یہ زیادتی ہے آپ کی"، میں نے کہا، "آپ ان کی تعریف کرنے میں بخل سے کام لے رہے ہیں۔ انھوں نے جی توڑ کے محنت کی تھی ——— اچھا اب آپ ان کو

کیا انعام دے رہے ہیں امتحان پاس کرنے کے صلے میں ؟

"انعام ونعام کچھ نہیں ملے گا۔ غلط بات ہے،" حسین نے کہا۔

"کیوں عشرت!" میں نے استادانہ شفقت کے ساتھ پوچھا، "کیا انعام ملنا چاہیئے تمھیں ؟"

غرض اس طرح ہنس ہنس کر زور زور سے باتیں کرتا رہا۔ میرا دل سینے کے اندر ماتم کر رہا تھا، لیکن میں اس کی فریاد کو اپنی آواز اور اپنے قہقہوں کے شور میں ڈبو دینا چاہتا تھا۔ میری حالت اُس شخص کی سی تھی جو اپنے گھر کو آگ لگا کر شعلوں کے دلفریب منظر سے لطف اُٹھائے، یا خودکشی کا تہیہ کر کے مرنے سے پہلے جھوٹی خوشی اور مصنوعی زندہ دلی کا اظہار کرے۔

اس ملاقات سے فارغ ہو کر میں نے کمرے سے باہر قدم رکھا تو میری حالت عجیب تھی۔ یہ معلوم ہو رہا تھا کہ میں کہیں سے زخمی ہو کر آ رہا ہوں۔ محبّت کی چوٹ روح کی گہرائیوں تک محسوس ہو رہی تھی۔

یہی وہ چوٹ تھی جو آج تین سال گزرنے کے بعد بھی تازہ ہے، جو شاید عمر بھر تازہ رہے گی۔

اور یہ سب ایک مذاق تھا۔ اُف! خدا کی پناہ!

کسی کی کہانی چاندنی کی زبانی

(۱۹۳۹ء)

یہ پچھلی رات کی سرگزشت ہے!

میں نے اپنا طویل سفر شروع کیا۔ سنسان جنگلوں اور وسیع میدانوں میں نور کی بارش کرتی ہوئی آگے بڑھی۔ میرے رُخ انور کی ضیاپاشیوں سے زمین کا ذرہ ذرہ جگمگا اٹھا۔ جہاں راتوں کو ہولناک تاریکیاں چھائی رہتی ہیں. وہاں میں نے طور کے جلوے بکھیر دیئے۔ جن فضاؤں پر قبرستان کا سناٹا طاری رہتا ہے ان میں لطیف و نازک موسیقی کی لہریں دوڑا دیں۔ مہیب درختوں اور گھنی جھاڑیوں کے قدموں میں سیال چاندی کے دریا بہا دیئے۔ میری چال اٹھلائی ہوئی تھی۔ میری ادائیں مستانہ تھیں۔ میرا نکھار نظر افروز تھا۔ مہینے کی چودھویں تاریخ تھی اور دنیا جانتی ہے کہ چودھویں رات کو میری سج دھج، میری چمک دمک، اور میرے حسن کا بناؤ انتہائی دلفریبی اور پاکیزگی کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ خیر، جنگلوں اور میدانوں کو عبور کرتی ہوئی

آگے بڑھی تو آم کے مہکتے ہوئے باغوں میں داخل ہوئی۔ سوئے ہوئے درخت جاگ اٹھے اور پتے آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ کوئل نے کوکنا شروع کیا۔ اس کا چوٹ کھایا ہوا دل میرے شباب کی بہار دیکھ کر تڑپ اٹھا، اور وہ بے قرار ہو ہو کر اپنا دکھ بھرا گیت الاپنے لگی۔ ساری فضا اس کے نشتریں نغموں سے معمور ہو گئی۔ یہ میری موجودگی کا اثر تھا، ورنہ کوئل کی کوک میں یہ دلگداز کیفیت اور یہ خنجریت کہاں! خود میں نے کوئل کی فریاد سے کوئی اثر نہ لیا۔ معشوقانہ بے نیازی اور محبوبانہ بے التفاتی کے ساتھ اپنے سفر کو جاری رکھا۔ تھوڑی دیر جھیل کی سطح پہ رقص کیا اور موجوں کی آغوش میں جھولا جھولا۔ پھر سرسوں کے لہلہاتے ہوئے کھیتوں میں پہنچ گئی بسنت پھولی ہوئی تھی اور دور دور تک پیلے پیلے پھولوں کا فرش بچھا ہوا تھا میں نے اپنے بازو پھیلا دیئے اور ان گلزاروں کو اپنی نور بھری آغوش میں لے لیا۔ میری سیمیاں پھولوں کی رنگت میں پیوست ہو گئیں اور ایک عجیب دلکش سماں بندھ گیا۔ میں اپنے حسن کو اسی طرح لٹاتی ہوئی چلی جا رہی تھی کہ تمدن اور انسانی آبادی کے آثار نمودار ہوئے ــــــ مصنوعی نہریں، بجلی کے تار اور کھمبے، فیکٹریاں اور کارخانے، پھونس کے جھونپڑے، کچے پکے مکانات، اور کہیں کہیں عالیشان کوٹھیاں! میں ان سب کو نور میں نہلاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اب میں شہر کی حدود میں قدم رکھ چکی تھی اٹھلاتی جھومتی، مستی بکھیرتی اور نور چھلکاتی چلی جا رہی تھی کہ سامنے درختوں کی آڑ میں مجھے اپنے پرستار شاعر کا دو منزلہ مکان دکھائی دیا۔ بالاخانے پہ جو نظر پڑی تو دیکھا کہ کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ دل اچھل پڑا۔ چھاتی دھڑکنے لگی۔ اور روح میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔

میں نے اپنے آپ سے کہا، "چاندنی! آج تو تمہاری قسمت جاگ اٹھی کھڑکی کھلی ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ تمہارا شاعر واپس آگیا۔"

یہ کھڑکی تقریباً ایک سال سے بند تھی۔ میں ایک سال تک اپنے حسن کی مکمل آراستگی کے ساتھ آتی رہی اور یہاں سے ناکام لوٹتی رہی۔ میں نہایت اشتیاق کے ساتھ چھم چھم کرتی ہوئی آتی، درختوں میں سے جھانک کر کھڑکی کی طرف دیکھتی، اور جب اس کو بند پاتی تو افسردہ ہوجاتی اور اپنے سیمیں ہاتھوں سے کھڑکی کی بلائیں لے کر ٹھنڈے سانس بھرتی ہوئی آگے بڑھ جاتی۔

یہاں ایک شاعر رہا کرتا تھا۔ وہ میرا پرستار تھا۔ میری صباحتوں پر جان دیتا تھا۔ اُس کو میرے جلوہ سیمیں کے ساتھ عشق تھا۔ جن راتوں کو میری آب وتاب معمول سے زیادہ ہوتی، خصوصاً چودھویں رات کو، میں کھڑکی کے راستے سے دبے پاؤں اس کے کمرے میں داخل ہوجاتی۔ وہ فرش پر بیٹھا ہوا مصروف مطالعہ نظر آتا۔ اس کے چاروں طرف کتابیں بے ترتیبی کے ساتھ پڑی ہوتیں۔ میں اندر پہنچ کر اپنی ساری آب وتاب اس پر نچھاور کردیتی اور خود اس کے قدموں میں لوٹنے لگتی۔ وہ کتاب ہاتھ سے رکھ دیتا اور کمرے کی مصنوعی روشنی کو گل کردیتا پھر میری طرف متوجہ ہوجاتا۔ محبت بھری نظروں سے مجھے دیکھتا۔ اس کے دل کی ساری بے چینی، اس کی روح کی ساری تڑپ، اس کے سارے شاعرانہ جذبات سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آجاتے۔ کبھی وہ فرش پر دراز ہوجاتا گویا مجھ سے ہم آغوش ہوجانا چاہتا ہے۔ کبھی گنگنانے لگتا۔ اور کبھی قدرے بلند آواز سے ایک سحر آفریں دھن میں گانے لگتا۔

فلک سے نور بھرے خم لنڈھا رہا ہے چاند　　میں صبح خلد نہ لوں ایسی رات کے بدلے

ساقی شراب لایا مطرب رباب لایا　　تجھ پر تو اک قیامت عہد شباب لایا

بدنام ہو گے جانے بھی دو امتحان کو　　رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

دشمن جان تھے تو جان مدعا کیوں ہو گئے　　تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

وہ ان شعروں کو اس قدر سوز و گداز کے ساتھ گاتا کہ میں اپنی روح میں ایک تموج اور ایک اہتزاز محسوس کرتی اور میرا سارا وجود مترنم ہو جاتا۔

اکثر ایسا بھی ہوتا کہ وہ گاتے گاتے اپنی بیاض نکال لیتا اور اس میں سے وہ اشعار پڑھنے لگتا جو اس نے میرے حسن کی تعریف میں لکھے تھے میری محبت شاید اس کی سرشت میں داخل تھی۔ کیونکہ اس کی قوت شعری کا بڑا حصہ میرے لئے وقف تھا اور میں اس کے شاعرانہ نغموں کے بہترین اجزاء پر قابض تھی۔ وہ میرے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا کرتا تھا:۔

"چاندنی ایک آگ ہے، پگھلی ہوئی، سرد اور بھیگی ہوئی! یہ میری سلگتی ہوئی جوانی کی ٹھنڈک ہے۔ کاش میں اس کو سمیٹ کر اپنے سینے میں رکھ سکتا!"

"اگر چاندنی کے سوا کائنات کی تمام دلفریبیاں ختم ہو جائیں تب بھی یہ دنیا حسین کہلانے کی مستحق ہو گی۔"

"دن کی روشنی مزدوروں اور سرمایہ داروں کے لئے ہے۔ اور چاندنی؟

یہ شاعروں، افسانہ نگاروں، عشق پسند اور خیال پرست لوگوں کے لئے خلق کی گئی ہے۔"

"چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ کائنات عمر خیام کا ایک خواب معلوم ہوتی ہے۔ بد بخت ہے وہ انسان جو ایسی رات سو کر گزار دیتا ہے۔"

"چاندنی ایک موسیقی ہے، سہانی، نرم اور معطر۔ یہ صرف درد مند لوگوں کی سمجھ میں آسکتی ہے۔"

"چاندنی ایک شراب ہے، روپہلی، نور میں ڈوبی دمکتی ہوئی! کاش میں اس شراب سے اپنا جام بھر سکتا!"

یہ اور اس قسم کے خیالات وہ میرے متعلق اپنے اشعار میں پیش کیا کرتا تھا جب وہ ان اشعار کو گاتا تو میں مست ہو جاتی اور جھومنے لگتی۔ یہ اس کا ہدیۂ محبت تھا، اور میں بصد شوق اس کو قبول کرتی۔

لیکن کچھ دنوں کے بعد اُس نے یہ اشعار گانے چھوڑ دئے۔ اب زیادہ تر ایسے شعر اس کے ورد زبان رہنے لگے جو ایک والہانہ شیفتگی اور ایک پر جوش جذبۂ عشق کے آئینہ دار ہوتے تھے:۔

رشک کرتی ہے مجھ پہ اک دنیا   شعر ہو، نغمہ ہو، بہار ہو تم

نظر گلرنگ، عارض لالہ گوں، زلفیں شمیم انگیز!
خدا آباد رکھے اس جوانی کے گلستاں کو

آئینہ نگاہ میں عکس شباب ہے
دنیا سمجھ رہی ہے کہ آنکھوں میں خواب ہے

سر زانو پہ ہو اُسکے اور جان نکل جائے
مرنا تو مسلّم ہے ارمان نکل جائے

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

صرف یہی نہیں کہ وہ ان اشعار کو گایا کرتا۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی تبدیلیاں مجھے اُس کے اندر نظر آئیں۔ اس کی جوانی کا روپ پہلے سے زیادہ نکھر گیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہو گئی ــــــ ایک لوچ، ایک رسیلا پن، ایک آرزو مندانہ کیفیت! ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی روح آنکھوں میں سے جھانک رہی ہے اور کسی کی پرستش کے لئے بے قرار ہے۔ میں نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس کو کسی سے محبت ہو گئی ہے، وہ کسی کافر ادا کی زلف سیاہ کا اسیر ہو گیا ہے، کسی ساحرہ کا جادو اس پر چل گیا ہے۔

اور میرا یہ خیال غلط نہ تھا۔ کیونکہ ایک رات جب میں اس کے کمرے میں گئی تو میں نے دیکھا کہ اس کے قریب ایک چھوٹی سی گول میز پر ایک دوشیزہ کی تصویر رکھی ہوئی ہے۔ یہ تصویر ایک نہایت نازک اور خوبصورت فریم میں جڑی ہوئی تھی اور یقیناً حسن و جوانی کا ایک نادر نمونہ پیش کر رہی تھی۔ آنکھیں شباب کی مستی سے لبریز تھیں اور ان سے نشہ برس رہا تھا۔ گویا شراب کے دو خم ہیں کہ لنڈھائے جا رہے ہیں! ہونٹوں سے تبسّم کا ایک چشمہ پھوٹ رہا تھا جس سے سارا چہرہ شاداب تھا۔ تصویر کا ہے کو تھی لطافت اور رعنائی کا ایک دلآویز خواب تھی۔

"تو واقعی شاعر محبت میں مبتلا ہے،" میں نے اپنے دل میں کہا، "اور یہ ہے وہ زہرہ جمال جس نے اُس کے دل کو مسحور کیا ہے، جس کی یاد میں وہ مزے لے لے کر عشق بھرے شعر گایا کرتا ہے۔"

اتنے میں شاعر نے میز پر سے تصویر اٹھائی اور اسے ہاتھ میں لے کر اس طرح دیکھنا شروع کیا جس طرح کوئی آئینہ دیکھتا ہے۔ اس وقت وہ اپنی آنکھوں سے صاف یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا تھا، "مجھے تم سے محبت ہے! میں سراپا آرزو ہوں! میں اشتیاق کی دنیا ہوں!" اور جب آنکھیں محبت کا پیغام پہنچا چکیں تو اس نے یہ شعر گایا اور کچھ اس طرح تڑپ کر گایا کہ میں اپنی نیم مدہوشانہ حالت سے چونک پڑی اور فضا میں ایک بجلی سی کوند گئی:۔

گراں گزرے گا عرض آرزو اُس طبعِ نازک پر

نگاہ شوق! اِس مضموں رنگیں کو ادا کر دے

یہ نغمہ ابھی فضا میں گونج ہی رہا تھا کہ اُس نے بے اختیار اپنا منہ تصویر پر رکھ دیا۔

"چاندنی! تمھارا پرستار اس دوشیزہ کو دل و جان سے چاہتا ہے،" میں نے اپنے آپ سے کہا۔

میں رشک و حسد جیسے انسانی جذبات سے عاری ہوں۔ اس لئے شاعر کی محبت کا راز معلوم کر کے میں بالکل رنجیدہ نہیں ہوئی۔ بلکہ میں نے مسرت کا ایک بے لوث جذبہ اپنی رگ و پے میں سرایت کرتا ہوا محسوس کیا۔ "میری خوشی تو اسی میں ہے کہ میرا پرستار خوش ہو،" میں نے اپنے دل میں خیال کیا، "پھر اگر وہ ایک دوشیزہ کے عشق

میں راحت اور مسرت کا سامان پاتا ہے تو میرے نزدیک اس سے بہتر اور کیا بات ہو سکتی ہے۔"

چنانچہ جوں جوں شاعر کی فریفتگی بڑھتی گئی میری مسرت میں اضافہ ہوتا گیا میں اُس کے کمرے میں جاتی۔ وہ محبت بھرے نغمے الاپتا۔ تصویر سے باتیں کرتا اور اس کو بار بار چومتا۔ میں یہ سب کچھ دیکھا کرتی اور اپنے ابدی سکون کی گہرائیوں میں ڈوبی ہوئی طمانیت کے مزے لوٹا کرتی۔

ایک رات میں، اُس کے کمرے میں پہنچی تو اس کو بہت افسردہ اور مغموم پایا۔ کمرے کی روشنی پہلے ہی سے گل تھی، اور وہ تکیوں میں اپنا چہرہ چھپائے فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ جب اس کو میری موجودگی کا احساس ہوا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، اور بے معنی نگاہوں کے ساتھ کھڑکی کے باہر دور کسی چیز کو تکنے لگا۔ پھر اس کی نظریں میز پر رکھی ہوئی تصویر کے اوپر جم گئیں۔ آج وہ تصویر کو میز پر سے اٹھاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ گویا کوئی چیز ہے جو دونوں کے درمیان حائل ہو گئی ہے۔ دُور سے بیٹھا حسرت کے ساتھ اس کو دیکھتا رہا اور ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرتا رہا۔ اس کی سرد آہوں سے میرے جسم میں ایک کپکپی سی دوڑ گئی اور میری روح تھرتھرا اٹھی۔ پھر اس نے ایک نہایت دردناک لے میں یہ شعر گایا:۔

میرے دھڑکتے ہوئے دل پہ ہاتھ رکھدے کوئی

کہ آج تھوڑی سی تسکین چاہتا ہوں میں

جتنی دیر میں وہاں رہی وہ اسی شعر کو گاتا رہا اور سرد آہیں بھرتا رہا۔ اب جب بھی میں جاتی اُس کو اسی سوگوارانہ کیفیت میں ڈوبا ہوا پاتی۔ وہ

اشعار بھی جو کچھ دنوں سے اس کی زبان پر رہتے تھے اور جن کے ذریعے وہ اپنے ولولۂ عشق کا اظہار کرتا تھا اُس نے گانے چھوڑ دیئے۔ اب اگر وہ کبھی گاتا بھی تو صرف ایسے شعر گاتا جن میں فراق کے صدموں کا ذکر ہوتا ؎

کیا قہر ہے جدائی جب چاندنی کھلی ہو
آنکھوں سے رات پیہم ٹوٹا کیے ستارے

جوانی اور نہگاموں سے خالی — یہ جیتا ہے یہ کوئی زندگی ہے

چاندنی اور اداس تنہائی — تم ہو کس حال میں خدا جانے

ایک دن اس آخری شعر کو گاتے گاتے اُس کا دل بھر آیا اور آنکھیں چھلک اٹھیں۔ پھر وہ کچھ اس طرح بیتاب ہو کر رویا کہ آنسوؤں کے دریا بہہ گئے۔ گویا ایک چھائی ہوئی گھٹا تھی کہ یکایک برس پڑی۔

ادھر چند دن سے جو اُداسی اور غمگینی اُس پر طاری تھی وہ میرے لئے ناقابلِ فہم نہ تھی۔ اور اس گریۂ بے اختیار کا سبب بھی میں سمجھ سکتی تھی۔ صورت حال سے صاف ظاہر تھا کہ اس کو محبت کی ناکامیاں ستا رہی ہیں اور جدائی کے صدمے خون رلا رہے ہیں۔ البتہ یہ سمجھنا میرے لئے مشکل تھا کہ یہ ناکامیاں کیوں ہیں اور ان جدائی کے صدموں کا باعث کیا چیز ہے۔ یا تو دوشیزہ نے اُس کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا، اور یا خارجی حالات کے سبب سے محبت کے راستے میں کچھ رکاوٹیں پیدا ہو گئی تھیں۔ بہر حال شاعر کی فراق زدگی ایک روح فرسا اور ناقابلِ انکار حقیقت تھی۔

اور اب جو میں نے اُس کو پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا تو میں بلبلا اٹھی۔ میرا دل اس کی تکلیف کے احساس سے پاش پاش ہو گیا۔ اگر خدا نے مجھے زبان دی ہوتی تو اُس وقت میں شاعر سے کہتی، "او میرے پرستار! میرے محبوب! تو دل تنگ نہ ہو۔ میں دنیا کے ایک سرے سے لیکر دوسرے سرے تک سفر کرتی ہوں۔ ہر جگہ جاتی ہوں۔ اور ہر مقام کی سیر کرتی ہوں۔ دنیا کی کوئی مہ جبین میری نظروں سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ وہ دوشیزائیں بھی جو حرم کی چار دیواری میں مقید ہیں اور سورج کی روشنی سے پردہ کرتی ہیں، میرے سامنے بے نقاب ہو جاتی ہیں۔ میں تیری محبوبہ کو کہیں نہ کہیں ڈھونڈھ ہی لوں گی، کسی نہ کسی دن ضرور اس کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔ اور جب وہ مجھے مل جائے گی تو اس کو اپنی روپہلی چادر میں لپیٹ لوں گی، اس کے چاروں طرف اپنے نور کا جال بچھا دوں گی۔ اور تیری محبت کا پیغام اس تک پہنچاؤں گی۔ تیری آہوں کا سوز، تیرے آنسوؤں کی موسیقی، تیرے اندوہناک نغموں کا گداز، تیری نگاہوں کی وارفتگی، تیرے مزاج کی آشفتگی، تیری بے خواب راتوں کی بے چینیاں، تیرے دل کی جلن، تیرے روح کی تپش، ان تمام چیزوں کو لے جا کر اُس کے قدموں میں ڈال دوں گی۔ وہ ضرور متاثر ہو گی۔ یقیناً تیری محبت کا جواب محبت سے دے گی۔ پھر یہ جدائی کے صدمے نہ رہیں گے۔ یہ محرومیاں اور الم نصیبیاں ختم ہو جائیں گی۔ میرے محبوب! تو دل تنگ نہ ہو!"

یہ سب میں اس سے کہتی اور اس طرح اس کو تسکین دیتی۔ مگر افسوس میں نطق سے محروم ہوں۔ میرے مرمریں ہونٹوں پر سکوت دوام کی مہر ثبت کر دی گئی ہے۔ میں اس سے کچھ نہ کہہ سکی۔ بیکسی کے ساتھ اس کو روتا ہوا دیکھتی رہی، اور جب روانگی کا وقت آیا تو اسی حالت میں اس کو چھوڑ کر چلی آئی۔

اگلے دن ادھر سے میرا گزر ہوا تو کھڑکی بند تھی۔ میں دیر تک کواڑوں کا سہارا لئے کھڑی رہی لیکن کھڑکی نہ کھلی۔ آخر کار مایوس ہو کر وہاں سے رخصت ہو گئی۔

اس طرح تقریباً ایک سال تک کھڑکی بند رہی۔ میں بدستور ماہ بہ ماہ اُدھر سے گزرتی رہی اور برابر اس سوال پہ غور کرتی رہی کہ شاعر یکایک کہاں چلا گیا اور کیوں چلا گیا۔ اس کے علاوہ یہ امید بھی برابر میرے دل میں رہی کہ ایک نہ ایک دن کھڑکی ضرور کھلے گی اور میں ضرور اپنے پرستار کو دیکھوں گی۔

چنانچہ گزشتہ رات جب میری نظر کھڑکی پر پڑی اور میں نے اس کو کھلا ہوا پایا تو میرا دل بلّیوں اچھلنے لگا۔ میں اپنی اُس وقت کی خوشی اور گھبراہٹ کو بیان نہیں کر سکتی۔ بہرکیف دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آگے بڑھی اور کھڑکی کے راستے سے کمرے میں داخل ہو گئی۔

شاعر موجود نہ تھا۔ لیکن وہ دودھ جیسا سفید فرش بدستور بچھا ہوا تھا۔ اور چاروں طرف کتابوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ چھوٹی میز بھی اپنی جگہ پر تھی، اگرچہ اس پر سے وہ تصویر غائب تھی جو کبھی شاعر کے پرستارانہ جذبات کا مرکز تھی۔ کمرے کی ظاہری ہیئت تقریباً وہی تھی جس سے میں ایک سال پہلے تک واقف تھی۔ کوئی قابل ذکر تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ تاہم مجھے ماحول کے مختلف اجزا میں ایک خاص ترتیب اور خاص سلیقے کا احساس ہوا۔ کمرے کی آرائش میں ایک نسوانی ہاتھ کی کارفرمائی نظر آ رہی تھی یہ شاعر کی سوگوار دنیا میں ایک خفیف مگر دلچسپ اضافہ تھا۔ میں اس پہ غور کرتی ہوئی کمرے کے اندرونی حصے میں پہنچ گئی۔ یکایک میری نظر ایک دوشیزہ پر پڑی جو ایک آرام دہ کرسی پر بے تکلفی کیساتھ بیٹھی ہوئی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مجھے گمان بھی نہ تھا کہ اُس کمرے

میں جہاں کبھی ایک تنہائی پسند شاعر کے سوا کسی دوسرے متنفس کو نہ دیکھا تھا، اس طرح ایک دوشیزہ سے دوچار ہونا پڑے گا۔ میں اس تصادم کے لئے قطعی تیار نہ تھی۔ گھبرا سی گئی اور بدحواس ہو کر اس کا منہ تکنے لگی۔ وہ میری موجودگی سے بالکل بے خبر تھی، اور ایک دلربایانہ انداز میں مصروف مطالعہ تھی۔ اُس کے بال کھلے ہوئے تھے۔ اور بسنت کے موسم کی لطیف ہوا کے ساتھ اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ چہرے کا سفید دمکتا ہوا رنگ نیلی ساڑھی کی وجہ سے اور بھی دمک رہا تھا۔ گردن جیسے بلّور کا ٹکڑا! عریاں سینہ جیسے آفتاب کی قاش! گوری کلائیاں جیسے سانچے میں ڈھلا ہوا نور! اور پاؤں، خدا کی پناہ! وہ اس قدر نازک اور شفاف تھے کہ معلوم ہوتا تھا مرمر کو تراش کر بنائے گئے ہیں یا برف کے گالوں سے تیار کئے گئے ہیں۔

میں اُس کے فردوسی حسن کا نظارہ کر رہی تھی کہ مجھے اس کی آنکھوں میں اور ہونٹوں پر کسی ایسی چیز کی موجودگی کا احساس ہوا جس سے میں آشنا تھی۔ حافظے میں حشر سا برپا ہو گیا۔ گویا یاد کے پوشیدہ خزانے کھنگالے جا رہے ہیں اور نہاں خانۂ ماضی میں سے کوئی چیز کھود کر نکالی جا رہی ہے۔ لمحہ بھر یہ کاوش رہی۔ اور اُس کے بعد گوہر مقصود ہاتھ آ گیا۔ میں اس حسن کی ملکہ کو پہچان گئی۔ اُس کی آنکھوں کی مستی اور ہونٹوں کا تبسم، یہ دونوں چیزیں میں اس تصویر میں دیکھ چکی تھی جو ایک سال قبل تک شاعر کے سامنے میز پر رکھی رہتی تھی اور جس کو پوج کر وہ اپنے جذبۂ پرستش کو آسودہ کیا کرتا تھا۔

میں خوشی کے مارے بیتاب ہو گئی۔ میں نے اپنے آپ سے کہا، "چاندنی! یہ شاعر کی محبوبہ ہے۔ تمہارے محبوب کی محبوبہ! یہ وہی کافرہ ہے جس نے کبھی شاعر کے دل کی دنیا کو تہ و بالا کر دیا تھا، جو اس کی زندگی کے پُرسکون دریا میں طوفان اور تلاطم

بن کر آئی تھی۔ وہ اس سے حاصل کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ آخر کار اُس نے اس کو پا ہی لیا۔ کتنی حسین ہے یہ! اور شباب سے کس قدر بھرپور! یہ واقعی پرستش کے قابل ہے۔"

میں ان خوشگوار خیالات میں ڈوبی ہوئی تھی کہ شاعر کمرے کے اندر داخل ہوا اور آکر فرش پر بیٹھ گیا۔ میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میں نے اُس کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا اور اس کے سامنے فرش پر لوٹنے لگی۔ ایک مرتبہ پھر میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش خدا نے مجھے زبان دی ہوتی اور میں شاعر سے کہتی "تم آگئے، میرے پرستار! میرے محبوب! تم آگئے، میں کتنی خوش ہوں! اور تم تنہا نہیں آئے بلکہ اپنے دل کی ٹھنڈک اور اپنی روح کے اُجالے کو بھی ساتھ لائے۔ تمہاری مراد بر آئی تمہاری امیدوں کا دامن پھولوں سے بھر گیا۔ تمہاری آہیں اور تمہارے آنسو رائیگاں نہ گئے، میں تمہیں مبارکباد دیتی ہوں۔ میں اپنی خوشی کا اظہار کرتی ہوں۔ آہ! میں کتنی خوش ہوں"

میں اس کے قدموں میں پڑی ہوئی تھی اور وہ خالی بے جان نظروں سے کھڑکی کے باہر دُور کسی چیز کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بے کیف تھا اور جذبات سے عاری۔ آنکھوں میں وہ شرارے نہ تھے جو ایک سال پہلے تک پائے جاتے تھے۔ نہ ہونٹوں پہ وہ تبسم کی بے قرار موجیں! وہ کسی الجھن میں مبتلا معلوم ہوتا تھا۔ شاید مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ یا شاید اُن دنوں کو یاد کر رہا تھا جب اس کی زندگی میں نہ محبت تھی نہ محبت کی تلخیاں اور شیرینیاں۔ بس ایک تڑپ تھی اور ایک بے چینی! اس کا سرشار دل تھا اور چاندنی راتوں کی پُر رونق بہاریں!

دوشیزہ کرسی پر بیٹھی ہوئی مطالعے میں مصروف تھی۔ وہ شاعر کی موجودگی سے اُسی

قدر بے پروا تھی جس قدر میری موجودگی سے بے خبر! شاعر بھی اس کی طرف کوئی توجہ نہ کر رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان دونوں کے تعلقات تکلف اور رسمیت کی تمام حدود کو توڑ چکے ہیں، اور اُس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں التفات باہمی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

یکایک شاعر چونک سا پڑا، جیسے کسی خواب سے بیدار ہو گیا ہو۔ اُس نے خشک لہجے میں دوشیزہ سے کہا، "روشنی گُل کر دو۔"

دوشیزہ نے اُس کی طرف اس انداز سے دیکھا گویا وہ اُس کی بات کا مطلب نہیں سمجھی ہے۔

بالآخر اُس نے کہا، "کیوں؟"

ایسا معلوم ہوا کہ کسی ساز کے ایک تار کو اتفاقاً مضراب چھو گئی اور ایک ہلکا سا نغمہ فضا میں گونج کر رہ گیا۔ اُس کی آواز بے انتہا سُریلی تھی!

"اس لئے کہ میں کہتا ہوں،" شاعر نے کڑک کر جواب دیا۔ آج میں نے اُس کی آنکھوں میں ایک نیا شعلہ دیکھا ــــــ غصے کی بھڑکتی ہوئی آگ!

میں سوچنے لگی کہ کیا یہ وہی شخص ہے جو ایک سال پیشتر اس عورت کی تصویر کو پوجتا تھا۔

دوشیزہ تقریباً ایک لمحہ بالکل ساکت رہی۔ پھر اُس کی آنکھوں میں جھنجلاہٹ کے آثار نمودار ہوئے اور ہونٹ بے طرح کانپنے لگے۔ اُس نے کتاب کو زور سے زمین پر دے مارا اور کرسی سے کھڑی ہو گئی۔ اُس کا سارا بدن جذبات کی شدت سے لرز رہا تھا۔

"اب تمھیں میرا پڑھنا بھی بُرا معلوم ہوتا ہے؟" اُس نے کہا اور بے اختیار رو پڑی۔

"پڑھنا بھی بُرا معلوم ہوتا ہے؟" شاعر نے اُس کے لفظوں کو حقارت آمیز لہجے میں دہرایا۔ "میں تمھیں پڑھنے کو کب منع کرتا ہوں! دوسرے کمرے میں جا کر نہیں پڑھ سکتیں، ہے؟"

"دوسرے کمرے میں!" دوشیزہ نے کہا، "اور اس کمرے میں کیا ہوا؟ یہ کیوں نہیں کہتے کہ مجھے تیری صورت بُری معلوم ہوتی ہے۔"

شاعر نے جواب دیا، "دیکھو مفت میں جھگڑا نہ کرو۔ میں اس روز روز کی لڑائی سے تنگ آ گیا ہوں۔ تم نے میری جان عذاب میں کر دی ہے۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں کہ میری وجہ سے تمھاری جان عذاب میں آ گئی ہے۔ تو پھر نکال باہر کرو نا۔ قصّہ ختم ہو۔ تمھارا جی بھر گیا! اب کیا ضرورت ہے تمھیں میری!

"پھر وہی! نکال باہر کرو! نکال باہر کرو! یہ کہنا خوب سیکھ لیا ہے۔ اگر مجھے ایسا کرنا ہوتا تو کبھی کا کر چکا ہوتا۔ یہ جو سال بھر سے مصیبتیں جھیل رہا ہوں، اِدھر سے اُدھر مارا پھر رہا ہوں......"

"سال بھر سے مصیبتیں جھیل رہے ہو تو کیا میں نے تم سے کہا ہے کہ مصیبتیں جھیلو؟"

"ہاں اور کیا؟ یہ سب تمھاری وجہ سے ہے۔ تم نے میری زندگی برباد کر دی۔"

"اور میری زندگی برباد نہیں ہوئی۔ میں نے اپنے ماں باپ کو چھوڑا، خاندان پر لات ماری۔ اپنی عزت گنوائی......" وہ اِس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی اس کی آواز بھرا گئی۔

"تم نے عزت گنوائی اور میں نے بڑی نیک نامی حاصل کی! میں نے سارے زمانے کی بُرائی مول نہیں لی؟ اپنے خاندان والوں کو دشمن نہیں بنایا؟ میں گھر سے بے گھر نہیں ہوگیا؟ سال بھر تک تمہیں لئے لئے پھرا۔ دنیا کی ٹھوکریں کھائیں......"

"اب اس سب کی ذمہ دار میں ہوں؟ میں نے اپنا سب کچھ اسی لئے قربان کیا تھا کہ جوتیاں کھاؤں!_____ میرے اللہ! یہ میں نے کیا کیا!" یہ کہہ کر وہ کرسی پر گر پڑی اور دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

"روؤ! خوب روؤ! تمہیں اور آتا ہی کیا ہے!" شاعر نے کہا۔

"میرے اللہ! یہ میں نے کیا کیا!_____ میرے اللہ! یہ میں نے کیا کیا!_____"

وہ یہ کہتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی۔

"اچھی طرح سے رو لو۔ میں جاتا ہوں" شاعر نے فرش پر سے اٹھتے ہوئے کہا اور باہر چلا گیا۔

دوشیزہ زور زور سے رونے لگی اس کی ہچکی بندھ گئی۔ کمرے کی فضا میں نالوں سے ارتعاش پیدا ہوگیا۔

مجھ سے اس کا رونا نہ دیکھا گیا۔ میں اس کے گریۂ بے اختیار کی تاب نہ لا سکی جس طرح دبے پاؤں کمرے میں گئی تھی اسی طرح دبے پاؤں چلی آئی۔

"میں اس کو صرف شاعر سمجھتی تھی، لیکن وہ پہلے مرد تھا اور بعد میں شاعر! آہ! یہ میں بھول گئی تھی" میں اس طرح سوچتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

یہ پچھلی رات کی سرگزشت ہے!